حضرت شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

مکتبہ اسلام

حضرت شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا صاحبؒ

یعنی عصر حاضر کے جلیل القدر عالم، محدث، مربّی اور مرشد روحانی
حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری ؒ کے سوانح حیات، علمی و عملی
کمالات اور ان کی دینی، اصلاحی، تربیتی خدمات کا مفصل تعارف
و جامع تذکرہ

از

مولانا ابوالحسن علی ندوی

بار سوم

ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ — جون ۲۰۰۲ء

کتابت ــــ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ــــ کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ

صفحات علاوہ انڈکس ــــ ۲۹۴

قیمت ــــ ۹۰/-

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع و ناشر

مکتبہ اسلام ۲۴ گوئن روڈ لکھنؤ

فہرست عناوین

"حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ"

باب دہم

تصنیفات و رسائل پر ایک تبصرہ

۲۴۱–۲۵۴

باب یازدہم

ارشادات و افادات ۲۵۵–۲۹۳

۴۸۹

در دامن من ز نرگست خون دامست کزان است
این ساغر دست گل بسمل دو جهان است
در هر سر از جنبش بسمل تو حکایت
در تکیه ز مستی چشم تو نشان است

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب کے مطالعہ سے پہلے

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

امابعد!

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کی سوانح کے سلسلہ کی یہ حقیر کوشش پیش کرتے ہوئے دل ودماغ دو متضاد تاثرات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک تو مسرت وشکر کا جذبہ کہ خدا کے ایک مخلص ومقبول بندہ کے حالات زندگی خدمات دینی وعلمی اور کمالات ظاہری وباطنی پر کچھ لکھنے کی سعادت حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو کوشش کی گئی ہے شاید وہ سعادت دارین کا سامان ہو جائے!

بقول شاعر ؎

حکایت از قد آں یار دلنواز کنیم
بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

ہندوستان نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں صدیوں سے جو دینی نظام تعلیم وتربیت کارفرما تھا اور جس کے حدود گھروں کی چہار دیواری سے لے کر مدارس ومساجد، حلقہائے درس، گوشہائے تصنیف وتالیف، خانقاہوں کی پرسکون فضاؤں اور سعی وجہد کی متحرک وپرشور رزمگاہوں تک وسیع تھے، اس کی بنیاد اخلاص وللہیت

ایمان واحتساب، اساتذہ وشیوخ کے معاملہ میں کامل اطاعت وانقیاد، مرتبوں اور متوسلوں کے معاملہ میں کامل تفویض وتسلیم، مقاصد زندگی کے بارے میں توکل وقناعت، اعتماد علی اللہ بلکہ ایثار وقربانی، محنت ومطالعہ اور حصول کمال کے سلسلہ میں استغراق وخود فراموشی، معاصرین کے ساتھ تعلقات میں تواضع واعتراف، مختلف الخیال عناصر وافراد وجماعتوں کے سلسلہ میں حسن ظن، التماس معذرت اور جمع بین الاضداد کی قوت وصلاحیت، کمالات علمی اور مدارج باطنی کے حصول میں علوِ ہمت ومجاہدہ، رفقائے کار وشرکائے حیات کے بارے میں اپنے فرائض کی ادائیگی سے سروکار اور اپنے حقوق کے مطالبہ سے خاموشی پر تھی۔ اس نظام تعلیم وتربیت کا (اپنی محدود معلومات اور کوتاہ نظر میں) بظاہر آخری نمونہ اور جامع ترین پیکر حضرت شیخ الحدیث کی ذات تھی، اس لئے ان کی زندگی کی کوئی ہلکی سے ہلکی تصویر پیش کرنا بھی اس دور کے تعلیمی وتربیتی عوامل واثرات کے (جو تدبیر الٰہی سے حضرت شیخ کے دور طفولیت وشباب اور ان کے ماحول میں جمع ہو گئے تھے) بہترین نتائج کا تذکرہ اور خلاصہ پیش کرنا ہے اور ایک ایسے دور کی تاثیر وکامیابی کی جلوہ نمائی کی کوشش ہے جو بظاہر حضرت شیخ کی وفات پر ختم ہو جاتا ہے، اس لئے یہ عصر حاضر کے ایک باکمال فرد کی سوانح نہیں، ایک مردم خیز دور، ایک مرد آفریں معاشرہ، ایک حیات بخش نظام تعلیم وتربیت اور ایک پُر ثمر اور شاداب شاخ ونہال کی آخری بہار کی کہانی ہے، اس لئے سوانح نگار کی محنت وقوت مطالعہ اور ذمہ داری فرد واحد کی سوانح نگاری تک محدود نہیں، اس سے کہیں زیادہ وسیع وعمیق اور نازک ہے اور ان اوراق کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے وقت دل ودماغ شدید طور پر اس بارے میں شبہ واضطراب میں مبتلا ہیں کہ یہ فرض ادا ہو سکا یا نہیں؟

بجائے تذکرہ رہ کر یہ خیال رہ رہ کر شکل لیتا ہے اور اس سے دل کے داغ تازہ ہو جاتے ہیں کہ اس بات کے پورے قرائن و آثار تھے کہ یہ سوانح خواجہ زادہ عزیزی گرامی مولوی سید محمد ثانی کے قلم سے نکلے گی انھوں نے حضرت شیخ کے حکم سے پہلے حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی ضخیم سوانح "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ" کے نام سے مرتب کی[1] اور حضرت شیخ کی خوشنودی اور تحسین کا پروانہ حاصل کیا، اور ان کی دعاؤں کی سعادت لی، پھر انہیں کے حکم سے ان کی شدید خواہش پر ان کے محبوب و مطاع شیخ و مربی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی سوانح "حیات خلیل" کے نام سے تالیف کی[2] پھر حضرت شیخ ہی کے ایماء اور ان کی تسکین قلب کے لئے ان کے جوان سال و جوان مرگ باکمال نواسہ مولوی محمد ہارون کی سوانح لکھی[3] ان تینوں کتابوں کی ترتیب و تالیف حضرت شیخ کے ان کے ساتھ تعلق خصوصی اور ان کی سوانح نگاری کی صلاحیت پر کامل اعتماد کی دلیل تھی کہ حضرت مولانا محمد یوسف سے حد درجہ تعلق و عقیدت رکھنے والے ان کے ساتھ سفر و حضر میں رہنے والے سینکڑوں علماء اور بیسیوں اہل قلم کی موجودگی میں شیخ نے اس وسیع اور نازک کام کی تکمیل کے لئے ان کا انتخاب کیا، پھر حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کے جیسے حضرت سہارنپوری کے با اختصاص مرید و خلیفہ و کہنہ مشق مصنف کی تالیف کردہ "تذکرۃ الخلیل" کی موجودگی میں حضرت کی سوانح کے از سر نو ترتیب دینے کا حکم فرمایا اور اس کام میں پوری رہنمائی و مدد فرمائی، پھر اس کا تقاضا

---

[1] یہ سوانح ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ سے شائع ہو چکی ہے۔

[2] مشتمل بر ۲۴۲ صفحات۔ [3] مشتمل بر صفحات ۱۴۴

سن کر اظہار اطمینان کیا اور دعائیں دیں، خود اپنے متعلق بھی ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ "چلو اب تو میری بھی سوانح لکھے گا۔"

لیکن قضاء و قدر کا فیصلہ دوسرا تھا، یہ کام وہ انجام نہ دے سکے اور اپنے شیخ کی وفات سے تقریباً تین مہینے پہلے خود سفر آخرت اختیار کیا، اپنے شیخ کی سوانح کی ترتیب کا ان کو موقعہ نہ مل سکا، لیکن حقیقت میں اس کام میں جو اس کتاب کی شکل میں آج قارئین کے سامنے ہے، ان کا بنیادی حصہ ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کے بعد جب انھوں نے اپنے شیخ کے حکم سے یا، یہ سوانح یوسفی کی تصنیف کا بیڑا اٹھایا جو حضرت شیخ کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی تو انھوں نے اپنی فطری سعادت و تواضع کی بنا پر مجھ سے یہ فرمائش کی کہ یہ حصہ میں لکھ دوں، ان کو اپنے قلم سے حضرت شیخ جیسی جامع اور مختلف الجہات شخصیت کا تعارف کراتے ہیں جو اس وقت فضل خداوندی سے مسند تربیت اور مسند ارشاد پر متمکن تھی، سخت تذبذب و حجاب محسوس ہوتا تھا، میں نے ان کی اس پریشانی کو دیکھ کر یہ مشکل کام اپنے ذمہ لے لیا، اس موقعہ پر سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کے مقدمہ میں میں نے جس طرح اس کا تذکرہ کیا ہے اس کو نقل کر دینا ہوں:-

"میری یہ خوش بختی ہے کہ میرے بزرگوں اور محسنین نے مجھے اپنی خدمت میں اتنا بے تکلف اور جری بنا دیا ہے کہ میں ان سے ہر طرح کے سوالات کر سکتا ہوں، اور میں نے بارہا ان سے خود ان کے حالات پوچھنے کی جرأت کی، اور ان کی بزرگانہ شفقت نے مجھے مایوس نہیں کیا، حد یہ ہے کہ

مولانا محمد الیاسؒ سے جن کو اس تاریخ نویسی سے اپنے معاصر بزرگوں میں سب سے کم مناسبت تھی اور جن کی زندگی سراپا دعوت و عمل تھی ان سے پہلی ہی ملاقات میں میں نے ان کے حالات زندگی دریافت کئے اور انھوں نے نہایت بشاشت و شفقت کے ساتھ نہ صرف ان کا جواب دیا بلکہ مجھے ان کو نوٹ کرنے کا موقع بھی دیا یہی معلومات مولانا کی سوانح کی بنیاد تھی۔

میں نے حضرت شیخ سے خطوط کے ذریعہ سوالات کر کے بہت سی قیمتی معلومات حاصل کیں بہت سی باتیں زبانی پوچھ پوچھ کر نوٹ کیں قدرتی طور پر ان کے لئے یہ ایک بہت بڑا مجاہدہ و ابتلا تھا لیکن اس کو میری خوش قسمتی کہئے یا بہرمندی یا ان کی شفقت و دل نوازی کہ میں نے اکثر ضروری معلومات حاصل کر لیں اور ان کی مدد سے ان کی سوانح حیات کا ایک سرسری و مختصر خاکہ حاصل کر لیا۔[۱]

واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ ضروری کام تقدیر الٰہی سے اس وقت انجام نہ پا گیا ہوتا تو میرے لئے اس سوانح کی تکمیل کا کام بہت مشکل ہوتا اور اگر وہ انجام بھی پا جاتا تو وہ اتنا مستند و قابل اعتماد نہ ہوتا جتنا موجودہ صورت میں نظر آتا ہے۔ حضرت شیخ نے اپنی "آپ بیتی" میں جو سات حصوں میں مرتب ہوئی ہے کہیں کہیں اس پر استدراک فرمایا ہے جس کا منشا زیادہ تر ان کی تواضع اور یہ جذبہ تھا کہ ذاتی حالات و کمالات سے زیادہ

---

[۱] حضرت شیخ کی حالات کا یہ حصہ "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ" میں ۲۳ صفحات ۷۵ ـ ۱۳۰ میں آ گئے ہیں۔

ان پہلوؤں کو نمایاں کرنا چاہئے جن میں طلبائے علوم دینیہ، فضلائے مدارس اور طالبین اصلاح کے لئے سبق اور پیغام ہے، چنانچہ ناچیز مصنف نے آپ بیتی کے اس پورے سلسلہ کو سامنے رکھ کر ان تشنہ گوشوں کی تکمیل کر دی ہے جن کی آپ بیتی میں نشاندہی کی گئی ہے، یہ پورا حصہ (صرف زمانۂ حال کو زمانۂ ماضی کے صیغہ میں تبدیل کر کے کہ وہ حالات شیخ کی زندگی میں لکھے گئے تھے) اس سوانح میں تحلیل کر دیا گیا ہے، اور وہی اس سوانح کا اصل تار پود ہے۔

اس مضمون کے علاوہ جو سوانح یوسفی سے اخذ کر کے شامل کیا گیا ہے، حالات کا بڑا ماخذ شیخ کی "آپ بیتی" کا سلسلہ، ان کی اردو تصنیفات اور شیخ کے با اختصاص بار آور مندوں اور مستفیدین کے مرتب کئے ہوئے سفروں کے حالات خصوصاً وہ قلمی سواد ہے، جو جنوبی افریقہ اور انگلستان کے سفروں کے موقعوں پر خصوصی خدام و رفقائے سفر نے قلمبند کئے، آخری مرض و وفات کے سلسلہ میں بھی مصنف کے سامنے وہ مستند معلومات اور خطوط رہے جو مدینہ طیبہ سے اہل تعلق کو لکھے گئے تھے، خاندانی معلومات کے سلسلہ میں مصنف نے خود اپنی کتاب "مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت" پر بنیاد رکھی ہے جس کا یہ حصہ (خاندانی حالات) دونوں جلیل القدر شخصیتوں کے حالات کا مشترک حصہ ہے، مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی کی کتاب "حالات مشائخ کاندھلہ" بھی پیش نظر رہی ہے جو بعض تاریخی تسامحات اور خامیوں کے باوجود (جن کی طرف کتاب میں اشارہ کر دیا گیا ہے) خاندانی حالات کا اچھا ماخذ ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے اسی خاندان والا شان کے ایک صاحب علم و تحقیق جواں سال فرد مولوی نور الحسن راشد صاحب کے اس مقالہ سے استفادہ کیا اور ان کی محنت و تحقیق سے فائدہ اٹھایا جو انھوں نے حضرت شیخ کے

آباؤ اجداد اور خاندان کے تعلق کے سلسلہ میں الفرقان کے خصوصی نمبر کے لئے سپرد قلم کیا تھا اور از راہِ عنایت مصنف کو بھی اس کی ایک نقل دے دی تھی، بعض دوسری معلومات اولاد و احفاد اور پس ماندگان کے سلسلہ میں مصنف مولانا محمد شاہد صاحب مظاہری کا ممنون ہے کہ وہ اس کے استفسارات کے جوابات دیتے رہے اور حضرت شیخ کی تصنیفات و رسائل کا پورا ذخیرہ اس کے پاس بھیج دیا۔ پس ماندگان پر اس کتاب میں جو نوٹ ہے وہ پورا انہیں کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

ناچیز مصنف کو حضرت شیخ کی خدمت میں [illegible] کی ابتداء سے نیاز حاصل ہے، ان کی اس کے حال پر جو شفقت و عنایت خصوصی رہی ہے اور اپنے گرامی ناموں میں جس طرح اس کا اظہار فرمایا ہے اس کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتا کہ ؂

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ بخشش ترے ابرو میں تھی

آمد و رفت و مراسلت کا سلسلہ پورے اکتالیس بیالیس سال قائم رہا، اپنی سی پوری کوشش کی کہ طویل سے طویل مکتوب گرامی سے لے کر چھوٹے چھوٹے پرچے تک کوئی ضائع نہ ہونے پائے یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ شفقت نامے جو ذاتی محبت و تعلق کے علاوہ بیش قیمت آراء گراں قدر مشوروں و رہنمائیوں اور قیمتی سوانحی معلومات نیز دلی جذبات و خیالات کے آئینہ دار ہیں سو فی صدی محفوظ رہے لیکن ان کی تعداد ۷۰۰ سے کم نہیں، ان خطوط کے مطالعہ سے خاص طور پر اس کتاب کے باب نہم "خداداد کمالات یگانہ مزاجی و ذوقی خصوصیات" میں بڑی مدد ملی۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری اور طالب علمانہ اور مصنفانہ دیانت کا تقاضہ ہے کہ

اس کتاب میں ان تفصیلات و جزئیات سے احتراز کیا گیا ہے جو کسی شیخ مقبول بارگاہِ الٰہی و رسالت پناہی، اور روحانی مراتب عالیہ پر فائز شخصیت کی سوانح حیات کا اصل مواد و مضمون سمجھا جاتا ہے یعنی خوارق و کرامات، مبشرات و منامات کی تفصیل جس کا پوری تفصیل و اطناب کے ساتھ ذکر کرنا اولیاء اللہ اور مشائخ چشتیہ کے قدیم سوانح نگاروں کا شیوہ رہا ہے، اور جن کی وجہ سے صاحبِ سوانح کے انسانی اخلاق، علمی و ذہنی کمالات، تعلیم و تدریس یا تصنیف و تالیف، معاصرین کے ساتھ تعلقات، روزمرہ کے معمولات، ان کی وسیع النظری، وسیع القلبی، حقیقت پسندی، اسلام کے لیے فکرمندی اور اہلِ اسلام کے لئے دردمندی پردے کے پیچھے چھپ کر یا ان کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گئی ہے، اور اسی بنا پر ان کے عہد اور ان کے بعد کے زمانہ کا علمی ذوق رکھنے والا اور قابلِ تقلید نمونہ اور قابلِ اتباع زندگی کا طالب و متجسس طبقہ ان کتابوں کے مطالعہ سے اکثر محروم اور ان کے کمالات کے دیکھنے سے محجوب رہا ہے، اندیشہ ہے کہ بعض قارئین کو اس کتاب میں یہ بات تشنہ نظر آئے گی، ہم اس جنس کے طلبگاروں کو (جو خدا کی ایک موہبت اور نسبت عالی کا کرشمہ ہے) ان رسائل و مقالات کے مطالعہ کا مشورہ دیں گے جو شیخ کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد خاص اسی مقصد کے لئے لکھے گئے ہیں[1]، کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اس علمی و فکری طبقہ کو بھی حضرت شیخ کے کمالات، ان کی جامعیت، ان کے علمی و تصنیفی مرتبہ، ان کی اخلاقی بلندی، ان کے علمی و تصنیفی انہماک، دینی کوششوں، اور تعلیمی اداروں سے گہرے تعلق، فکرمندی و دل سوزی، علوم دینیہ، عقائد صحیحہ اور مسلک حق کی اشاعت سے دلی شغف، مسلمانوں کے حال و مستقبل کی فکر اور رجوع الی اللہ اور اتباع شریعت و سنت کی دعوت اور اس کے لئے جدوجہد کا اندازہ ہو، اور اس کتاب کو پڑھ کر

[1] مثلاً محبوب العارفین، بہجۃ القلوب وغیرہ۔ از صوفی محمد اقبال ہوشیارپوری

اس کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہو، اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس ہو، ہمت میں بلندی، قلب و نظر میں وسعت، وقت کی قیمت اور زندگی کی کوتاہی کا شعور، عمل نافع اور باقیات صالحات کے ذخیرہ کا شوق و آرزو پیدا ہو۔

اس کتاب کو پڑھ کر قارئین کو اگر صاحب سوانح اور مصنف سوانح میں وہ تفاوت عظیم اور وہ مسافت طویل نظر آئے جس کی بنا پر ان کو اس سوانح کی تصنیف کے لئے ——— اس بے بضاعت مصنف کے انتخاب پر اعتراض اور انتخاب کرنے والوں کے صحت انتخاب میں (جن میں عزیز گرامی قدر مولوی محمد طلحہ صاحب خلف الرشید حضرت شیخ پیش پیش رہے ہیں) شبہ اور اشکال ہو تو مصنف اس کے جواب میں عرفی کا یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو جائے گا۔

امید ہست کہ بیگانگی عرفی را
بدوستی سخنہائے آشنا بخشند

ابوالحسن علی
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۶ محرم الحرام [illegible]ھ
۱۳ / نومبر [illegible]ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

خاندان جدِ بزرگوار مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ اور ان کے صاحبزادگان

شرفائے جھنجھانہ و کاندھلہ

جھنجھانہ اور کاندھلہ کا یہ خاندان جس سے حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب اور ان کے اخلاف (مولانا ابوالحسن صاحب مولانا نور الحسن صاحب مولانا مظفر حسین صاحب سے لے کر مولانا انعام الحسن صاحب امیر جماعت تبلیغ تک) اور حکیم کریم بخش صاحب اور ان کے اخلاف (جن میں مولانا محمد اسماعیل صاحب اور ان کے فرزندان و نبیرگان مولانا محمد صاحب، مولانا محمد یحییٰ صاحب، مولانا محمد الیاس صاحب اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب شامل ہیں) دو آپ کا مشہور و محترم صدیقی شیوخ کا خاندان ہے[1] جس میں ہر دور میں صاحب علم و فضل، اہل ارشاد اور اصحاب وجاہت پیدا ہوتے رہے۔ "حالات مشائخ کاندھلہ" (تالیف مولانا احتشام الحسن صاحب) کے پیش لفظ میں راقم نے اس خاندان کی امتیازی شان اور اس کی مردم خیزی پر حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا، اس موقع پر اس کا نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:۔

ہندوستان کے ان چیدہ و برگزیدہ خاندانوں میں جو صدیوں تک علم و فضل

---

[1] مکتوب حضرت شیخ الحدیث مد ظلہ

اور ذہانت و ذکاوت کے گہوارے بنے ہوئے ہیں۔ صدیقیوں کا ایک وہ خاندان بھی ہے
جس کا اصل وطن جھنجھانہ ضلع مظفر نگر اور وطن ثانی کاندھلہ ضلع مظفر نگر ہے،
یہ گھرانہ ان خوش قسمت خاندانوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت و
عنایت سے نوازا۔ اس خاندان کی بنیاد کچھ ایسے صدق و اخلاص پر پڑی تھی کہ
صدیوں تک یکے بعد دیگرے اس میں علماء و فضلاء و اہل کمال اور متقین پیدا
ہوتے رہے، علوئے استعداد و علوئے ہمت اس کی خاندانی خصوصیت ہے اور
انہیں دو چیزوں نے اس خاندان کو ایسا شرف و امتیاز عطا کیا کہ ہر دور میں
باکمال اور اکابر رجال پیدا ہوتے رہے، علوئے استعداد و علوئے ہمت نے اس خاندان کے
افراد میں علمی جامعیت اور تبحر کی شان پیدا کی، اور انہوں نے اپنے اپنے وقت
میں مروجہ علوم اور اکثر اصناف کمال کی طرف توجہ کی، اور ان میں دستگاہ
پیدا کی، اس کی وجہ سے اس میں بلند پایہ فقیہ و محقق، جامع معقول و منقول عالم
قادر الکلام شاعر، اور حاذق طبیب پیدا ہوئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے فیض نے
اتباع سنت، اصلاح عقائد و اعمال کا ذوق اور اشاعت علم کا جذبہ پیدا کیا،
حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، اور
توحید و اتباع سنت کے ساتھ جذبۂ جہاد و سرفروشی کا اضافہ کیا، حضرت مولانا
مظفر حسین صاحب کاندھلوی کے یگانۂ روزگار ورع و تقویٰ اور ان کی مجاہدہ
و جفاکشی نے مردوں کے ماسوا بیبیوں اور بچیوں میں بھی احتیاط و تورع اور
ذکر و عبادت کا ذوق پیدا کر دیا۔

پھر اس خاندان کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اپنے موروثی فضل و کمال اور سلسلۂ روحانی کے باوجود اپنے اپنے زمانے کے مقبول مشائخ اور خاصانِ خدا سے جو اپنے فن کے امام اور اپنے زمانہ میں مرجع خلائق تھے استفادہ و اخذ میں تامل نہیں کیا، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوریؒ اور دوسرے معاصر بزرگوں سے اس خاندان کے اہل کمال اور اہل طلب برابر تمسک اور وابستہ ہوتے رہے اور یہ سلسلہ بحمد اللہ اب تک جاری ہے اور یہ اس کے صدقِ طلب علو ہمتی کی دلیل ہے۔

اس خاندان کی قبولیت اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی جو نگاہِ عنایت ہے اس کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس دور میں اس خاندان سے دعوت و اصلاح کا وہ عظیم الشان کام لیا جس کی نظیر اس وقت عالم اسلام میں ملنی مشکل ہے، مشہور تبلیغی دعوت تحریک کا یہی خاندان سرچشمہ و منبع ہے، اسی خاندان میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ جیسی شخصیت پیدا ہوئی جس سے اللہ تعالیٰ نے اس دور میں تجدیدی شان کی خدمت لی اور جن کے اخلاص، علو ہمت، علو نظر، مجاہدہ اور قربانیوں کے اثرات و برکات اور فیوض و ثمرات اس وقت دنیا کے ایک بڑے حصہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے بعد ان کے خلف الرشید مولانا محمد یوسف صاحب اس کی توسیع و تکمیل میں مشغول ہیں[1] ان کا

---

[1] یہ سطور بارہا جب لکھی گئیں تو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ حیات اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور جماعت کی سرپرستی و نگرانی میں مصروف و سرگرم تھے رحمہ اللہ تعالیٰ۔

صدق و اخلاص، ان کا توکل و اعتماد، ان کی محبت کی تاثیر، ان کا جذبۂ جوش اور
ان کا بجا طور پر وجیہ عہد شاہجہانی کی حیثیت رکھتی ہے جن کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ
"عیاں را چہ بیان" اسی طرح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی
ذات گرامی اسلاف اور ان کے کمالات کی زندہ یادگار اور اپنے خاندان کی علو ہمت، مجاہدہ
وجاہت اور اخلاق کی ایک جیتی جاگتی تصویر اور دور ماضی کے واقعات کی تصدیق ہے۔[1]

اس خاندان کے بزرگوں میں حکیم محمد اشرف صاحبؒ کے حالات بزرگان خاندان کے مقابلہ میں بہ ترتیب زمانی
اور ان کی وجاہت اور شہرت کی وجہ سے زیادہ نمایاں اور محفوظ ہیں اس لئے انہیں سے ابتداء کی جاتی ہے۔

مولانا حکیم محمد اشرفؒ

آپ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے اور عہد شاہجہانی کے مشہور بزرگ تھے جن کے علم
و فضل، زہد و تقویٰ، اتباع شریعت پر تمام معاصر علماء اور مشائخ متفق تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب
شیخ قطب شاہ تک اس طرح ہے:۔

مولوی محمد اشرف بن شیخ جمال محمد شاہ بن شیخ بابن شاہ بن شیخ بہاء الدین شاہ بن
مولوی شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ۔[2]

---

[1] خاندان مشائخ کاندھلہ از مولانا احتشام الحسن صاحب ص ۲-۶ بشمول الفاظ و تعارف از راقم سطور۔

[2] تحریر قلمی حضرت شیخ الحدیث؛ خاندانی شجرہ میں صرف شیخ قطب شاہ تک سلسلہ ہے۔ حالات مشائخ کاندھلہ ص ۵
مولوی نور الحسن صاحب کاندھلوی کی اولاد اس خاندان کے ایک فرد علم اور تحقیق کا خاص ذوق رکھنے والے نوجوان عبدالرحیم
محقق کے مطابق شجرے کے آخر میں مذکور دو شخص شیخ محمد فاضل اور شیخ قطب شاہ کا اس خاندان سے کوئی تعلق
نہیں یہ دونوں نام الحاقی ہیں، ان کی تحقیق میں خاندان مولانا محمد اشرف جھنجھانوی قاضی ضیاء الدین ملتانی کی
اولاد میں ہے۔ (باقی صفحہ ۲۳ پر)

مولانا حکیم محمد اشرف کی اولاد میں کثیر التعداد علماء و فضلاء و مشائخ طریقت جن میں فقیہ مفتی روحی جامع معقول و منقول عالم اور قادر الکلام شاعر اور حاذق طبیب مسلسل پیدا ہوتے رہے مولانا حکیم محمد اشرف کے حالات نہایت دلچسپ اور اولیائے کاملین کے سے ہیں جن سے خوارق کا بھی ظہور ہوا ہے ان کے چند واقعات اس خاندان کے فرد فرید حضرت مفتی [illegible] نے اپنی قلمی بیاض میں تحریر کئے ہیں نمونۃً ایک واقعہ تحریر کیا جاتا ہے جس سے ان کے استغناء اور دنیا سے بے رغبتی کا حال معلوم ہوگا۔

شاہجہاں بادشاہ منصب آپ کے کمالات کا شہرہ سن کر ملاقات کا مشتاق ہوا اور آپ کو بلانے کے لئے پالکی اور کچھ لوگوں کو بھیجا۔ آپ علی الصباح نماز فجر پڑھ کر دوپٹہ کمر پر باندھ کر دہلی کی طرف روانہ ہوئے بادشاہ کی طرف سے شہر کے دروازہ پر آدمی استقبال کے لئے متعین تھے آپ کی روانگی کی اطلاع پاکر انھوں نے آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا اور آپ نے اس امیر کی ہمراہی میں جو آپ سے پہلے سے واقف اور معتقد تھا بادشاہ سے ملاقات کی بادشاہ نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں علامی سے کہا کہ مولوی صاحب کا امتحان کرنا چاہئے چنانچہ وزیر نے متفرق علوم کے متفرق سوالات کئے اور ہر علم میں یگانہ روزگار پاکر بادشاہ سے عرض کیا کہ شیخ کو میں نے ایسا بحر زخار پایا جس کا کہیں کنارہ نہیں۔

(باقی صفحہ ۲۱ کا) ——— مولانا شیخ محمد سے شجرہ اس طرح ہو جاتا ہے۔

مولانا شیخ محمد ابن مولانا کریم الدین بن [illegible] بن امام [illegible] بن امام [illegible] بن قاضی ضیاء الدین سنامی کی اس کی دلیل یہ ہے کہ مولانا شیخ محمد سے قاضی ضیاء الدین سنامی تک کا سلسلہ نسب فرمان سلطان محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق مورخہ [illegible] رجب [illegible] کی پشت پر لکھا ہوا ہے جو بنام [illegible]

شاہجہاں بادشاہ نے اس وقت علاقہ جھنجھانہ میں دو ہزار بیگہ پختہ زمین کا فرمان تیار کرا کے آپ کی خدمت میں پیش کیا مگر آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا اور کہہ دیا کہ ہمارا رازق خدا ہے نہ کہ بادشاہ، بادشاہ کے پاس آیا ہوں مال و ملک و جاگیر کے حصول کی طلب و خواہش بالکل نہیں اور نہ اس کے لئے آیا ہوں[1]

مولانا حکیم محمد اشرف کے ایک صاحبزادے ـــ کا نام حکیم محمد شریف تھا یہ بھی علم و فضل اور اتباع شریعت میں اپنے والد ماجد کے قدم بقدم تھے، مولانا حکیم محمد شریف کے دو صاحبزادے ہوئے ایک مولانا حکیم عبدالقادر جن کی اولاد میں اہل کمال اور علماء کی خاصی بڑی تعداد میں گزرے ہیں خصوصاً مفتی الٰہی بخش اور ان کے نامور بھتیجے مولانا مظفر حسین کاندھلوی ممتاز ترین علماء و فضلاء وقت میں سے تھے، دوسرے صاحبزادے مولانا محمد تقی تھے جن کا قیام جھنجھانہ میں رہا ان کی اولاد میں مولانا محمد اسماعیل کاندھلوی، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی ان کے فرزند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، داعی الی اللہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف کاندھلوی جیسے اہل فضل و کمال اور بلند پایہ بزرگ پیدا ہوئے۔

جھنجھانہ اور کاندھلہ کی دونوں شاخیں مولوی محمد شریف صاحب پر جا کر مل جاتی ہیں، پھر الگ الگ ہدایت تک بار آور اور ثمر آور رہتی ہیں، اس اتصال اور انفصال کو سمجھنے کے لئے یہاں دونوں شاخوں کا مختصر شجرہ پیش کیا جاتا ہے جو خود حضرت شیخ الحدیثؒ کا مرتب کیا ہوا ہے[2]۔

---

[1] حالات مشائخ کاندھلہ صفحہ ۱۵-۱۶ بحوالہ غرائب الہند از مولانا محمد ساجد۔

[2] تحریر بخط حضرت شیخؒ محفوظ در قلمی خطوط والے رجسٹر سے نقل کی گئی ہے اس لئے نام اسی طرح لکھے گئے ہیں جیسے اصل میں درج ہیں۔

- مولوی محمد شریف
  - عبد القادر
    - قطب الدین
      - شیخ الاسلام
        - محمود بخش
          - مظفر حسین
            - بی بی امۃ الرحمن
              - بی بی صفیہ
        - مفتی الٰہی بخش
          - مولوی ابو الحسن
            - مولوی نور الحسن
              - (بی بی صفیہ اور مولوی نور الحسن کی اولاد:) محمد سلیمان، محمد اکبر، محمد ابراہیم، احتشام الحسن، محمد مظفر
                - اکرام الحکیم، آمنہ، صفیہ، رؤف الحسن، شمس الحسن
                  - (صفیہ:) محمد الیاس، محمد یحییٰ
  - مولوی محمد فیض
    - مولوی محمد ساجد
      - حکیم غلام محی الدین
        - حکیم کریم بخش
          - غلام حسین
            - مولوی اسماعیل
              - مولوی محمد
              - مولوی محمد یحییٰ
                - محمد زکریا شیخ (الحدیث)
              - مولانا محمد الیاس صاحب
                - مولانا محمد یوسف صاحب
          - غلام حسن

کاندھلہ سے تعلق[1]
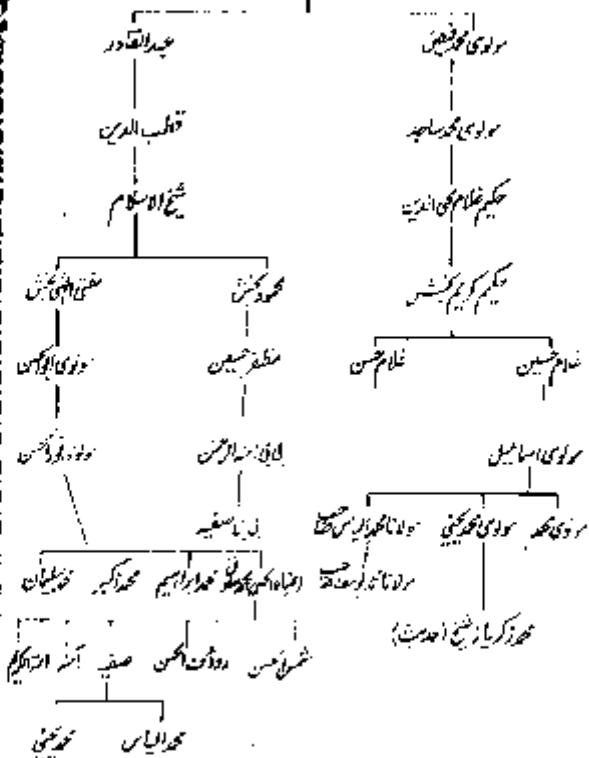
قاضی شیخ محمد جو سلطان (ابو الفتح) محمد ابن فیروز (تغلق) کے زمانہ میں کاندھلہ کے قاضی اور خطیب تھے ان کی اولاد میں انھیں کے ہم نام شیخ محمد مدرس ایک بہت بڑے عالم و فاضل اور اپنے وقت کے صاحب دل بزرگ گزرے ہیں ان کی صاحبزادی عثمان بی بی کے ساتھ جھنجھانہ کے مذکورہ الصدر گھرانے کے مولانا حکیم عبد القادر کی جو مولانا حکیم محمد شریف ابن حکیم محمد اشرف کے صاحبزادہ تھے شادی ہوئی ان کے دو صاحبزادے ہوئے (۱) مولانا حکیم قطب الدین (۲) مولانا حکیم شرف الدین۔

مولانا حکیم قطب الدین جھنجھانہ کے شرفاء و زعماء میں تھے اور اطراف میں ان کا بڑا اثر تھا، اللہ تعالیٰ نے دینی بزرگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی وجاہت بھی عطا کی تھی، ان کی شادی بھی کاندھلہ میں اسی گھرانے میں ہوئی جس گھرانے میں ان کے والد حکیم عبد القادر کی ہوئی تھی، ان کی بیوی شیخ ضیاء الحق ابن شیخ محمد مدرس کی بیٹی تھیں، ان کے تین صاحبزادے ہوئے (۱) مولانا حکیم شیخ الاسلام (۲) شیخ محمد شاہ (۳) شیخ صدر الدین، موخر الذکر دونوں بزرگ

[1] کاندھلہ کی آبادی کی تقریب اس طرح ہوئی کہ ۲۲ رجب ۷۵۴ھ میں سلطان محمد شاہ ابن فیروز شاہ تغلق شکار کے [illegible] کاندھلہ کی آبادی کے قریب آیا، اسی دوران میں جمعہ کا دن آگیا، سلطان موصوف نے کاندھلہ کی آبادی اور جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا، فوراً جامع مسجد تعمیر کی گئی، جمعہ کے وقت سلطان نے آکر خود حصہ لیا اور موجود وقت ایک جامل اور باکمال عالم قاضی شیخ محمد ابن مولانا کریم الدین جو قاضی ضیاء الدین شامی کی اولاد میں تھے کو [illegible] بیگہ زمین کا فرمان دے کر قضاء، امامت، خطابت، احتساب کا منصب عطا کیا اور قصبہ کی آبادی پر مامور کیا، اور بعد ان کی اولاد نے یہیں رہائش اختیار کرلی۔ (حالات مشائخ کاندھلہ مترجم ص ۔)

تصانیف ذیل میں درج ہے۔

مولانا شیخ الاسلامؒ

مولانا شیخ الاسلامؒ علم وفضل میں ممتاز تھے اور بڑے بڑے علماء ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مولانا شیخ الاسلامؒ کے چار صاحبزادے ہوئے (۱) مفتی الٰہی بخش (۲) شاہ کمال الدین (۳) مولوی امام الدین (۴) مولوی محمود بخش۔ یہ چاروں صاحبزادے علم وفضل میں یگانۂ روزگار اور مرجع خلائق تھے۔

مولوی امام الدین، مفتی الٰہی بخش سے چھوٹے تھے، اور ذکاوت وذہانت اور علمی قابلیت میں ممتاز تھے۔ "میر زاہد" "ملا جلال" کی شرح "حاشیہ امور عامہ" "رسالہ شمسیہ اور بعض مختصر کتابیں" اور منطق وفلسفہ کی مختلف کتابوں پر تعلیقات یادگار رہیں ———— ایک فرزند مولانا حکیم اشرف یادگار چھوڑا، جو مفتی الٰہی بخش کے داماد ہوئے وہ طب میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے اور نبض شناسی میں فائق، ان کے صاحبزادہ مولوی حکیم محمد شرف بھی اپنے زمانہ کے مشہور اطباء میں شمار ہوتے تھے۔

مولانا شیخ الاسلامؒ کے دوسرے صاحبزادے مولانا کمال الدین کو تصنیف اور [illegible] کا خاص ذوق تھا، زہد وتقویٰ میں ممتاز تھے، مفتی الٰہی بخش نے ان کا یہ واقعہ لکھا ہے:-

وسخت سردی کی راتوں میں آدھی رات کو اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے نماز تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ اس سخت سردی میں اٹھنا اور ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بہت دشوار ہے۔ تم روزانہ کس طرح کرتے ہو وہ بولے سونا، جب میں وضو سے فارغ ہوتا ہوں تو وسوسۂ شیطانی اور نفسانی دل میں آتے ہیں کہ کل کو سردی میں نہ اٹھوں گا، تو افل کے لئے اتنی سخت اذیت اٹھانا دشوار ہوتا ہے۔ جب اگلی رات آتی ہے اور چکی پیسنے والیوں کی آواز کانوں میں آتی ہے تو میں بے قرار ہو کر اٹھ جاتا ہوں کہ بھائی اللہ اس سخت سردی میں اپنے دن کی روزی کی خاطر آدھی رات سے اٹھ کر صبح تک بھاری بھاری چکی کے پاٹ کو کس محنت و مشقت کے ساتھ گھما رہی ہیں۔ میرے لئے جس کی روزی کی کفالت بے محنت و مشقت حق تعالےٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے) ——

مروت سے بعید تر ہے کہ خواب غفلت میں سرشار رہوں اور اپنے رازق کا شکر ادا نہ کروں۔ میں نے جب سنا تو سمجھ گیا کہ بیدار دل شخص ہے۔[1]

اس کے علاوہ جود و کرم، ایثار، مروت و شفقت، خدمت خلق، مسافر کی خبر گیری میں بڑے مستعد تھے۔ عمر بھر سماع، مزامیر اور مجالس لہو و لعب سے پرہیز رکھا۔

مفتی الٰہی بخش صاحب

مولانا حکیم شیخ الاسلام کے نامور فرزند اور مرجع خلائق بزرگ عالم تھے۔ سنہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۵ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضرت شاہ

---

[1] حالات مشائخ کاندھلہ، ص ۲۲

عبدالعزیز دہلوی کے ممتاز ترین شاگردوں میں تھے اپنے وقت کے نامور صاحب فتویٰ،
صاحب درس، صاحب تصنیف تھے کامل طبیب اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں اعلیٰ دستگاہ
رکھتے تھے عربی و فارسی اور اردو نظم پر یکساں قدرت تھی جس کی شاہد ان کی تصنیف کردہ
کتاب شرح بانت سعاد ہے جس میں حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہر عربی شعر کا ترجمہ
عربی فارسی اور اردو شعر میں کیا ہے، عربی، فارسی کی تقریباً ساٹھ تصانیف یادگار ہیں
شیم الحبیب اور مثنوی مولانا روم کا تکملہ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلق اور ان کی تحریک سے وابستگی

مفتی صاحب تعلیم کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ہی سے بیعت ہو گئے تھے
حضرت سید احمد شہیدؒ کی تشریف آوری پر[1] باوجود کبر سنی[2] اور سید صاحب سے ۳۸-۳۹ سال
بڑے ہونے کے رجوع کیا اور بڑے اخلاص و محبت کے ساتھ استفادہ کرتے رہے،[3]

---

[1] سید صاحب کے کاندھلہ پہنچنے کی تاریخ ۸ ربیع الاول ۱۲۳۷ھ ہے۔

[2] مصنف "حالات مشائخ کاندھلہ" کی تحریر کے مطابق اس وقت مفتی صاحب کی عمر ۷۰ سال سے متجاوز تھی
مفتی صاحب کی پیدائش ۱۱۶۲ھ کی ہے اور سید صاحب کی کاندھلہ تشریف آوری ۱۲۳۷ھ میں ہوئی۔

[3] شیخ کامل کی موجودگی میں اس کے قوی نسبت خلفاء سے استفادہ اور ان سے توجہ اور فیض
حاصل کرنے کی مثالیں بکثرت ہیں۔ مشائخ کبار کی سوانح و حالات میں بہت ملتی ہیں، بعض اوقات
خود شیخ بیعت نے کسی خاص مرید کو اس کی ہدایت کرتا ہے کہ میرے فلاں مسترشد سے استفادہ کرو اس کی
ایک واضح مثال وہ ہے جو مولانا کرامت علی صاحب جونپوری نے اپنے رسالہ "نور علیٰ نور" میں لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ
مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی نے فرمایا کہ میں سلوک راہ نبوت بادہ حاصل کرنے کا ذوق و شوق رکھتا تھا

اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت سید احمد شہیدؒ کی مدح و توصیف میں کثرت اشعار کہے۔ دو غزلوں کے چند چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

یارب! جوان دلِ تشنہ دانم چہ شود | سیر احمد زمند گر بجود گاری را
اے تشنہ لب رحیق طلب ہمت کن | از دستِ سید بر حق کہ شد یاری را

جناب سید احمد کہ بانند فیض ربانی | بسان مہرِ انوری کند ہر ذرہ نورانی
مجدد الف ثانی شد جناب محمد اول | مجدد مائۃ ثالث را جناب احمد ثانی
تجلی احمدی کامل بنور ایزدی واصل | نمودانند در شش جہت حق رسانی نفس انسانی

مفتی صاحبؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے طریقہ و اذکار میں ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی جس کا نام "ملہمات احمدیہ" ہے جس کو "صراط مستقیم" کا خلاصہ کہنا صحیح ہوگا۔[1]

مفتی الٰہی بخش کے دونوں صاحبزادے مولانا ابو الحسن صاحب اور مولانا ابو القاسم صاحب سید صاحب کے دست گرفتہ اور معتقد و مخلص تھے۔ مولانا ابو الحسن حضرت سید صاحب کے ایسے عاشق و محب تھے کہ سید صاحب کے حج سے واپسی پر ایک قصیدہ لکھا جو پورا اظہار محبت

(ثانی ص ۱۷۲ کو) ارشادات و صحبت تاثیر کا غلغلہ جا بجا کان میں پڑا اور جان بخشی اور دل نواز ہوا۔ اس کے بعد ارادہ ہوا کہ زیارت و صحبت کا شرف حاصل کرنے کا شوق اتنا غالب ہوا کہ دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سکون و آرام رخصت ہو گیا۔

[1] کتاب کا پورا نام ملہمات احمدیہ فی الطریقۃ المحمدیہ ہے ۱۲۸۴ھ میں بمعین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خان والی ٹونک کی فرمائش پر مطبع سعید عام آگرہ سے شائع ہوئی کتاب کی ضخامت ۸۰ صفحات متوسط سائز ہے کتاب میں سید صاحب سے ملاقات اور ان کا دعا میں آنے کی تاریخ درج ہے جو ۲۱ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ ہے (ص ۳)

مولانا حیرت لکھتے ہیں:-

"ہر قسم کی سربراہی و امداد و اعانت تمام تر سید احمد شہید مرحوم کی جماعت کو اسی کاندھلہ کا خاندان اور جھنجھانہ کا یہ پورا خاندان حضرت سید احمد شہید اور ان کی تحریک کا گرویدہ تھا۔ گھروں میں اندر باہر جہاں دیکھو، مرد ہو یا عورت سب کی زبانوں پر اسی تحریک کا چرچا اور حضرت سید احمد شہید کا تذکرہ تھا۔"[1]

مولانا محمد ساجد جھنجھانوی

مولانا حکیم محمد شریف کی اولاد میں دوسری شاخ مولانا محمد فیض سے چلی جن کے نامور فرزند مولانا حکیم محمد ساجد جھنجھانوی تھے جو ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے، بڑے صاحب فضل و کمال اور متبحر عالم اور حاذق طبیب تھے۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے ان کے متعدد قصائد نقل کئے ہیں۔ شاہجہان بادشاہ نے جو دو ہزار بیگہ معافی کا فرمان ان کے جد امجد مولانا حکیم محمد اشرف کی خدمت میں پیش کیا تھا اور جس کو موصوف نے قبول نہیں کیا تھا، وہ پھر حکیم مولانا محمد ساجد کی خدمت میں پیش کیا گیا جو آپ نے قبول فرمالیا۔[2] اس طرح آپ دینی اور علمی کمال کے ساتھ ساتھ دنیوی عزت و وجاہت کے مقام پر بھی فائز تھے۔ آپ نے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام "مجیب الغرائب" تھا۔ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ آپ کے ایک فرزند تھے جن کا نام حکیم غلام محی الدین تھا، اور ان کے بھی ایک فرزند حکیم کریم بخش نامی تھے۔ حکیم کریم بخش کے دو فرزند ہوئے (۱) شیخ غلام حسن (۲) شیخ غلام حسین۔

---

[1] جھنجھانوی: ترجمہ: ہماری قوم حضرت سید احمد شہید کے قافلہ کی سربراہی اور اعانت میں لگی رہی۔

[2] حالات مشائخ کاندھلہ صفحہ ۱۰۔ مولانا احتشام الحسن صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ یہ فرمان مولانا محمد اشرف کے بھائی کے نام ۱۰۴۸ھ میں جاری ہوا تھا۔

مولانا محمد صابر اور مولانا محمد مصطفےٰ شہیدؒ اور ان کی اولاد

شیخ غلام حسن کی شادی حضرت مفتی الٰہی بخش کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن سے دو فرزند تولد ہوئے (۱) مولانا حافظ محمد صابر (۲) مولانا حافظ محمد مصطفےٰ شہید۔

مولانا محمد صابر درویش صفت صوفی منش عابد و زاہد بزرگ تھے حضرت سید شہیدؒ کے ہمراہ معرکۂ جہاد میں شرکت کی اور واپسی کے بعد ساری زندگی سید صاحبؒ کے قافلہ کی امداد و اعانت میں گزار دی۔ ایک فرزند چھوڑا جن کا نام حافظ محمد عبداللہ تھا۔ جو زہد و تقویٰ میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے۔ دل میں جہاد کا شوق رہتا۔ آخر میں بینائی جاتی رہی۔ ہر وقت ان کی زبان پر یہ فقرہ رہتا "کوئی بندوق دے دو جہاد کو جاتا ہوں"[۱]۔

آپ نے دو فرزند چھوڑے (۱) حافظ محمد یوسف (۲) حافظ محمد یونس۔ اللہ تعالےٰ نے ان دونوں بزرگوں کو خیر و صلاح کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ صاحب حالات مشائخ کاندھلہ نے ان دونوں بزرگوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:-

"ان دونوں بزرگواروں کا ابتدائی زمانہ تو سلسلہ ملازمت باہر گزرا لیکن اپنے اخیر دور میں کاندھلہ کی زینت اور رونق بسلسلہ تھے نورانی شکلیں پیاری باتیں اسلامی اطوار و عادتیں وضعداری احباب نوازی ملنساری ہر ایک کی ہمدردی اور خیر خواہی اور غمگساری ان دونوں بھائیوں کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اور دونوں دیندار متقی پرہیزگار تہجد گزار بزرگ تھے"[۲]

حافظ محمد یوسف کی پہلی اہلیہ سے تین صاحبزادیاں ہوئیں جن میں دو کی بچپن میں ہی وفات ہو گئی (؟) ...

۱؎ حالات مشائخ کاندھلہ ص ۲۰۰ ۲؎ ایضاً

ذکر و عبادت آ گئے مسافروں کی خدمت اور قرآن مجید و دین کی تعلیم شب و روز کا مشغلہ تھا، خدمت و تواضع کا یہ عالم تھا کہ جو مزدور بوجھ لائے ہوئے پیاسے آتے اور گزرتے ان کا بوجھ اتار کر رکھ دیتے اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر ان کو پانی پلاتے پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اے اللہ تو نے مجھے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق دی، میں اس قابل نہ تھا، عام اجتماع و ہجوم کے زمانہ میں پانی اور لوٹوں کا خاص اہتمام رکھتے اور رضائے الٰہی اور قربت خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خلق خدا کی راحت رسانی اور خدمت میں مشغول رہتے۔[۱]

مولانا ہر وقت ذاکر و با خدا رہتے تھے، مختلف اوقات و حالات کے متعلق حدیث میں جو اذکار و اوراد آئے ہیں ان کی پابندی کرتے تھے اور آپ کو اس طرح مرتبہ احسان حاصل تھا۔[۲]

ایک مرتبہ آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے طریق سلوک کے حصول کی خواہش کی، مولانا نے فرمایا کہ آپ کو اس کی حاجت نہیں، جو اس طریق اور ان ذکر و اذکار کا مقصود ہے وہ آپ کو حاصل ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید پڑھنے کے بعد یوں کہے کہ قاعدہ بغدادی میں نے نہیں پڑھا اس کو بھی پڑھ لوں۔[۳]

مولانا کو قرآن مجید کی تلاوت اور درود سے خاص شغف تھا، یہ ان کی تمنا تھی کہ بکریاں چراتا رہوں اور قرآن پڑھتا رہوں، رات کو اس کا خاص اہتمام تھا کہ گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی جاگتا رہے، ۱۲-۱ بجے تک منجھلے صاحبزادہ مولانا محمد یحییٰ صاحب مطالعہ میں مشغول رہتے اس وقت مولانا محمد اسماعیل صاحب بیدار ہو جاتے، اور مولانا محمد یحییٰ صاحب سو جاتے، پچھلے پہر بڑے صاحبزادے مولانا محمد صاحب کو بیدار کر دیتے۔[۴]

۱؎ روایت مولانا محمد الیاس صاحبؒ ۲؎ ارواح ثلاثہ ۳؎ روایت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، بعض تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی سے بیعت و خلافت کی اجازت تھی دارالعلوم دیوبند کی روداد میں آپ کو جانشین مولانا مظفر حسین لکھا گیا ہے (افادہ مولوی احتشام الحسن صاحب کاندھلوی) ۴؎ ایضاً

طبیعت اتنی صلح کل واقع ہوئی تھی کہ کسی کو آپ سے کوئی شکایت نہ تھی، اپنے ہمعصر ایسے تھے کہ اکثر نے یا ہمہ بنا دیا تھا، آپ کی للّٰہیت، خلوص و بے نفسی ایسی آشکارا تھی کہ دہلی کی مختلف الخیال جماعتیں جو اس زمانہ میں ایک دوسرے سے سخت متوحش و متنفر تھیں اور ان میں سے ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کا روادار نہ تھا، ان کے پیشواؤں کو آپ پر یکساں اعتماد اور آپ کی ذات سے بلا اختلاف عقیدت تھی۔[1]

میوات سے تعلق بھی آپ کی حیات میں شروع ہوا، اس کی تاریخ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ تلاش و فکر میں نکلے کہ کوئی مسلمان آتا جاتا نظر پڑے تو اس کو مسجد میں لے آئیں اور اس کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ لیں، چند مسلمان نظر آئے، ان سے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو؟ انھوں نے کہا مزدوری کے لئے، پوچھا کیا مزدوری ملے گی؟ انھوں نے مزدوری بتائی، فرمایا اگر اتنی مزدوری یہیں مل جائے تو پھر جانے کی کیا ضرورت؟ انھوں نے منظور کر لیا، آپ ان کو مسجد میں لے آئے اور نماز سکھانے اور قرآن پڑھانے لگے، یومیہ مزدوری ان کو دے دیتے اور ان کو پڑھنے اور سیکھنے میں مشغول رکھتے، کچھ دنوں کے بعد نماز کی عادت پڑ گئی اور مزدوری کی چھوٹ گئی۔ یہ بنگلہ والی مسجد کے مدرسہ کی بنیاد تھی، اور یہ پہلے طالب علم تھے، اس کے بعد ۱۰-۱۲ میواتی طالب علم برابر مدرسہ میں رہتے، اور ان کا کھانا مرزا الٰہی بخش مرحوم کے یہاں سے آتا۔[2]

۴ شوال ۱۳۱۵ھ (۲۶ فروری ۱۸۹۸ء) مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے انتقال فرمایا۔ غفرلہ تاریخ وفات ہے، آپ نے دہلی شہر میں بہرام کے ترائے کی کھجور والی مسجد میں وفات پائی۔ مقبولیت عامہ کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جنازہ کے ساتھ چلنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اگرچہ جنازہ میں دونوں طرف بلیاں بندھی ہوئی تھیں تاکہ لوگوں کو کاندھا دینے میں سہولت ہو

---

[1] بروایت مولانا محمد الیاس صاحب [2] روایت مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی۔

مگر اس کے باوجود میت سے لوگوں کو دہلی سے نظام الدین تک (جو تقریباً سات میل ہے) کاندھا دینے کا موقعہ نہیں ملا۔[1]

جنازہ میں مختلف جماعتوں کے لوگ بکثرت شریک تھے اور مختلف العقیدہ اور مختلف الخیال مسلمان جو کم ایک جگہ جمع ہو سکتے تھے اس موقعہ پر مجتمع تھے مولانا کے منجھلے صاحبزادہ مولانا محمد یحییٰ صاحب فرماتے تھے کہ میرے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب بڑے نرم مزاج اور متواضع بزرگ تھے، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ کسی بزرگ کی تواضع فرمائیں اور نماز پڑھانے کے لئے اس کو اشارہ کر دیں اور دوسری جماعت کے لوگ اور ان کے پیشوا ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں، اس طرح اس موقعہ پر ایک نامناسب صورت پیش آئے اس لئے میں خود آگے بڑھ گیا اور میں نے کہا کہ میں خود نماز پڑھاؤں گا سب نے اطمینان کے ساتھ میرے پیچھے نماز پڑھی اور کوئی اختلاف و انتشار نہیں پیدا ہوا۔[2]

جنازہ میں اتنا ہجوم اور ایسی کثرت تھی کہ لوگوں نے بار بار نماز پڑھی جس کی وجہ سے دفن میں کچھ تاخیر ہوئی اس عرصہ میں ایک صاحب اور ایک بزرگ نے یہ دیکھا کہ مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جلدی رخصت کرو میں بہت شرمندہ ہوں کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ میرے انتظار میں ہیں۔[3]

مولانا کے صاحبزادے

مولانا محمد اسماعیل صاحب کے تین صاحبزادے تھے پہلی بیوی سے مولانا محمد صاحب

---

[1] از حضرات نظام الدین۔ [2] از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

[3] روایت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ منقول از مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت (از مصنف صفحہ ۴۲-۴۳)

جو سب سے بڑے بھائی تھے اور اپنے والد کے جانشین ہوئے، دوسری بیوی سے (جو مولانا
مظفر حسین صاحب کی نواسی تھیں اور جن سے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد نکاح کیا تھا)
دو بیٹے عبد اللہ ہوئے: محمد یحییٰ صاحب اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہم تھے۔

مولانا محمد صاحب

مولانا محمد صاحب ایک فرشتہ سیرت انسان تھے، حلم و تواضع، رحمت و شفقت،
اور خشیت و انابت کا مجسم تصویر اور صحیح مصداق تھے "اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا"
والی آیات کا ایک نمونہ، کم گو، بے آزار، عزلت پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے
بزرگ تھے، متوکلانہ و زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، نظام الدین کی بنگلہ والی مسجد میں اپنے
والد ماجد کی جگہ قیام تھا، ایک مدرسہ تھا جو ان کے والد مرحوم کا جاری کیا ہوا تھا جس میں
ابتدائی تعلیم ہوتی تھی اور زیادہ تر میوات کے بچے پڑھتے تھے، لوگ کل وقت مدرسہ کا کام
چلتا تھا، دہلی اور میوات میں آپ سے بہت لوگ ارادت و عقیدت رکھتے تھے، اور دونوں
جگہ آپ سے فیض تھا، مولانا محمد صاحب کی صورت سے تقوے کا سبق ملتا تھا، انوار کی
چہرہ پر نہایت کثرت تھی، اکثر وعظ نہیں فرماتے تھے، اگر بیٹھ کر جیسے کہ کوئی باتیں کرتا ہو
سلسل تقریر کی صورت نہیں ہوتی تھی بلکہ اخلاق و زہد کی احادیث سناتے اور ان کا
سادہ ترجمہ اور مطلب بیان فرماتے۔

کسی زمانہ میں آنکھ کے قریب کوئی پھنسی نکلی تھی جس پر یکے بعد دیگرے سات
شگاف آئے، ڈاکٹروں نے فوراً زخم ضروری بتایا، مگر انھوں نے شدت سے انکار کیا

---

[1] مثلاً حاجی عبدالرحمٰن صاحب (شاگرد مولانا محمد صاحب) وغیرہ۔

اور یونہی بے حس و حرکت لیٹے رہے، ڈاکٹر متحیر تھے کہ ہم نے عمر بھر اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

مولانا محمد صاحب نہایت ذاکر شاغل اور پُرجوش اوقات بزرگ تھے، حدیث مولانا گنگوہی سے پڑھی تھی، انتقال سے پہلے دس سال تک ان کی تہجد فوت نہیں ہوئی آخر وقت تک نماز جماعت سے پڑھی، عشاء کی نماز کے بعد وتر کے سجدہ میں انتقال ہوا۔[1]

مولانا محمد الیاس صاحبؒ

مولانا محمد اسماعیل صاحب کے چھوٹے صاحبزادہ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے حالات و کمالات اور ان کی دعوت اور اس کے اثرات و فتوحات کے تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں کہ۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

اس موضوع پر ناچیز مصنف کی مستقل کتاب "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت"[2] کا مطالعہ مفید ہوگا۔

حضرت شیخ کے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ

آپ مولانا محمد اسماعیل صاحب کاندھلوی کے منجھلے صاحبزادہ تھے، آپ کی

---

[1] تحریر مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی (مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت ص۵۵-۵۶)

[2] اس کتاب کے کئی ایڈیشن ہندوستان پاکستان میں نکل چکے ہیں، انگریزی و عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے، انگریزی ترجمہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ" سے شائع ہوا ہے۔

والدہ صاحبہ بی بی صفیہ[1] مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی نواسی اور بی بی امۃ الرحمٰن کی صاحبزادی تھیں[2]، بڑی پاکیزہ صفت، عابدہ اور زاہدہ اور ذکر و شغل کرنے والی خاتون تھیں۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب بروز پنجشنبہ غرۂ محرم ۱۲۸۸ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے تاریخی نام بلند اختر تھا[3]، آپ فطرتاً ذہین و ذکی اور طبعاً لطیف المزاج پیدا ہوئے تھے، سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا، اور اس کے بعد والد صاحب کا ارشاد تھا کہ ایک قرآن روز پڑھ لیا کرو، باقی سارے دن چھٹی، مولانا محمد یحییٰ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز پڑھ کے امی[4] کے مکان کی چھت پر قرآن شریف کی تلاوت کرتا، اور جب تک ختم نہ کر لیتا روٹی نہ کھاتا، پھر ایسا نہ ہوتا کہ قرآن شریف کے ختم پر وہ آرام کرتے ہوں بلکہ علم کا ذوق ان کو مزید کتابوں کے مطالعہ پر آمادہ کرتا، اور اسی تازگی اور نشاط سے کتابوں کا مطالعہ کرتے، وہ خود فرماتے تھے:۔

"میں عموماً ظہر سے قبل پورا قرآن مجید ختم کر لیا کرتا، اور پھر کھانا کھا کر چھٹی کے وقت میں اپنے شوق سے فارسی پڑھا کرتا تھا[5]"

---

[1] مولانا محمد یحییٰ صاحب کی والدہ صاحبہ کے دلچسپ حالات، اوراد و اشغال، اور حفظ و تلاوت قرآن کے غیر معمولی خصوصیات کے لئے ملاحظہ ہو "مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" ص ۲۲-۲۳

[2] بی بی امۃ الرحمٰن صاحبہ ایک رابعہ سیرت بی بی تھیں، حالات کے لئے ملاحظہ ہو "مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" ص ۴۱-۴۳

[3] بلند اختر سے ۱۲۸۷ھ نکلتا ہے، شاید اختلاف رویت اس کا سبب ہو، ولادت اخیر ذی الحجہ میں ہوئی ہو، اس بنا پر یہ تاریخ نکالی گئی، اور دوسری جگہ محرم کی رویت ثابت ہو گئی ہو، اس لئے تاریخ ولادت ۱۲۸۸ھ درج کی گئی ہے۔

[4] یعنی بی بی امۃ الرحمٰن صاحبہ۔

[5] حالات مشائخ کاندھلہ ص ۲۲۱

آپ کے والد مولانا محمد اسماعیل صاحب چونکہ بڑے شب زندہ دار بزرگ تھے اور نماز تہجد کا بڑا اہتمام فرماتے تھے اس لئے آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب کو اخیر شب یا سویرے ہی سے اٹھا دیا کرتے تھے کہ شروع ہی سے اس کی عادت پڑے۔ مولانا محمد صاحب تو اٹھ کر طویل نفلیں پڑھا کرتے تھے مگر مولانا محمد یحییٰ صاحب مختصر نوافل پڑھ کر کتاب دیکھنے میں لگ جاتے کہ طبیعت اس پر چلتی تھی۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب خود فرماتے تھے کہ والد صاحب کو وضو کے اوراد کا خاص اہتمام تھا اور ہم پر بھی اصرار تھا کہ پابندی کریں مگر مجھے علم کی دھن تھی، اس لئے میں وضو کرتا ہوا بھی فارسی اور عربی کے لغات یاد کیا کرتا۔ والد صاحب میری زبانی کو سنتے تو ملامت کے طور پر فرمایا کرتے "خوب وضو کی دعائیں پڑھی جا رہی ہیں" شرم کی بات ہے۔[1]

ادب کے متعلق مولانا خود فرماتے تھے:۔

"تمام ادب میں استاد سے میں نے صرف مقامات حریری کے دو مقامے پڑھے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ استاد نے کہلا بھیجا کہ میرے مکان کو آتے جاتے راستہ میں پڑھ لیا کرو۔ اس لئے میں ساتھ جاتا اور راستہ میں پڑھا کرتا۔ اور اکثر جگہ ارشاد فرما دیا کرتے کہ اس لفظ کے معنی مجھ کو معلوم نہیں خود دیکھ لینا۔"[2]

آپ کی علمی استعداد اور علوم نقلیہ کے ساتھ فنون عقلیہ کی مہارت تامہ اس نوعمری ہی میں مسلّم اور مشہور ہونے کے ساتھ علمائے عصر میں حیرت کی نظروں سے دیکھی گئی کہ بڑوں بڑوں کو مولانا سے علمی مکالمہ میں فخر تھا۔[3] عربی ادب میں آپ کو اتنی مہارت تھی کہ نظم و نثر دونوں بے تکلف لکھ لیتے تھے۔

۱؎ تذکرۃ الخلیل صفحہ [illegible] (طبع [illegible]) ۲؎ ایضاً صفحہ [illegible] ۳؎ ایضاً صفحہ [illegible]

شوال ۱۳۱۱ھ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی خدمت میں حدیث پڑھنے تشریف لے گئے، چونکہ بڑے بھائی مولانا محمد صاحبؒ نے حدیث شریف حضرت گنگوہیؒ سے پڑھی تھی، اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کو حضرت گنگوہیؒ سے بڑی عقیدت تھی اس لئے انھیں کی خدمت میں حدیث شریف پڑھنے گئے، لیکن اس زمانہ میں حضرت گنگوہیؒ کو نزول ماء کی شکایت ہوچکی تھی، اس لئے حدیث کا درس بند ہوچکا تھا، لیکن مولانا محمد یحییٰ صاحب نے وہیں کا قیام اختیار کرلیا، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی درخواست پر دورۂ حدیث پھر شروع ہوگیا، یہ حضرت کا آخری درس تھا، جس کی رونق اور روح رواں مولوی یحییٰ صاحب ہی تھے، جب تک باہر رہتے درس رکا رہتا، مولانا کا ایسا اعتماد اور دل میں جگہ حاصل تھی کہ کسی کام کو گئے تھوڑی دیر کے لئے کہیں جاتے تو مولانا بے چین ہوکر فرماتے، مولوی یحییٰ نابینا کی لاٹھی ہیں۔[1]

مولانا محمد یحییٰ صاحب نے اثنائے درس میں اس کا بھی اہتمام کیا تھا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کی تقریروں کو جو سبق میں سنتے خارج وقت میں ضبط کرکے نقل فرما لیتے اور لکھ لیا کرتے جو بعد کو کتاب حدیث کی ایک مستقل تعلیق اور نادر الوجود شرح بن گئی تھی۔[2] پورے بارہ سال حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گزارے اور اس پوری مدت میں حضرت گنگوہیؒ کی محبت و شفقت کی آغوش میں پلے، اور اسی وقت گنگوہ سے رخصت ہوئے جبکہ حضرت گنگوہیؒ وصال فرماگئے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری چونکہ آپ کی ذکاوت اور ذہانت اس وقت جانچ چکے تھے، جبکہ آپ دہلی میں طالب علم تھے، اس لئے آپ مدت سے متمنی تھے کہ کسی طرح مولانا محمد یحییٰ صاحب مدرسہ مظاہر العلوم میں درس حدیث

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الخلیل ص ۲۳-۲۴ [2] ایضاً ص

کے لئے آجاتیں۔ مولانا کو چند روز کے لئے بلایا اور تیسرے سال مستقل قیام پر زور دیا۔ چنانچہ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ میں مولانا مدرسہ مظاہر العلوم میں درس حدیث کے لئے مستقل تشریف لائے اور اس وقت سے لے کر ساڑھے پانچ سال کامل مدرسہ میں برابر درس حدیث دیتے رہے اور کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا۔[1]

معاش کے لئے ایک تجارتی کتب خانہ قائم کر رکھا تھا جس کا کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ عجیب باغ و بہار طبیعت لے کر آئے تھے۔ بکّاء باللیل بسّام بالنہار (رات کو بہت رونے والے دن کو بہت مسکرانے والے) آپ کی صفت تھی۔ ادھر گریہ طاری ہے ادھر دوستوں کو اپنے لطیفوں اور بذلہ سنجیوں سے ہنسا رہے ہیں۔ دیدۂ گریاں، روئے خنداں، اور زبان گل افشاں کا پورا مجموعہ تھے۔ دل کے سوز و گداز اور راتوں کے راز و نیاز کا تجربہ کم لوگوں کو تھا۔ معمولی آدمیوں کی طرح رہتے۔

قرآن شریف سے بڑا شغف تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی "تذکرۃ الخلیل" میں لکھتے ہیں:-

"ایک مرتبہ میری درخواست پر آپ رمضان میں قرآن شریف سنانے کے لئے میرٹھ تشریف لائے تو دیکھا دن بھر میں چلتے پھرتے پورا قرآن مجید ختم فرما لیتے تھے اور افطار کا وقت ہوتا تو ان کی زبان پر "[illegible]" ہوتی تھی۔ ریل سے اترے تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہنے کی عادت تھی اس لئے مسجد میں قدم رکھتے ہی مصلے پر آ گئے اور تین گھنٹے میں دس پارے ایسے صاف اور رواں پڑھے کہ نہ کہیں لکنت تھی نہ تشابہ گویا قرآن شریف سامنے کھلا رکھا ہے اور

---

[1] تذکرۃ الخلیل ص [illegible]

اطمینان پڑھتے رہے آپ تیسرے دن ختم فرما کر روانہ ہو گئے کہ دور کی ضرورت تھی نہ سامع کی حاجت[1]:

مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی حالات مشائخ کاندھلہ میں لکھتے ہیں :-

"حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کا معمول تھا کہ ہر رمضان المبارک میں اپنی ہونہار اور نانی صاحبہ کو قرآن شریف سنانے کے لئے کاندھلہ تشریف لے آتے اور پھر تین شب میں پورا قرآن شریف سنا کر واپس تشریف لے جاتے جس سال ذی الحجہ میں آپ کا وصال ہوا اس رمضان میں ایک ہی شب میں پورا قرآن مجید سنایا اور اگلے ہی دن واپس تشریف لے گئے[2]"

قرآن کریم کے شغف اور درس حدیث کے علاوہ خدمت خلق، حسن سلوک و ظیفہ زندگی تھا بیواؤں اور مسکین، نادار طلبہ کے ساتھ عمر بھر حسن سلوک فرماتے رہے اور ایسے پوشیدہ طریقہ سے یہ کام کرتے کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہوتی سادگی اور اپنے نفس کی طرف سے استغناء کا یہ عالم تھا کہ قریب شاید پانچ روپے کا غلہ بھی ایک دفعہ نہیں ڈلوایا۔ مگر مصارف خیر پر خرچ کا یہ عالم تھا کہ جس وقت انتقال ہوا تو آٹھ ہزار روپے کے مقروض تھے اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ کس مد میں خرچ ہوا[3]۔

۱۰ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ کو انتقال فرمایا انتقال کے وقت چھیالیس سال کی عمر تھی گویا جوانی ہی کا زمانہ ہے سہارنپور کے مشہور قبرستان حاجی شاہ میں جہاں مولانا محمد مظہر صاحب بانی مدرسہ مظاہر العلوم اور مدرسہ مظاہر العلوم کے اور دوسرے اکابر بھی آرام فرما ہیں مدفون ہوئے۔

۱؎ تذکرۃ الخلیل ص۳۰۴ ۲؎ حالات مشائخ کاندھلہ ۳؎ تذکرۃ الخلیل ص۳۰۵

مولانا محمد الیاس صاحب کا معمول تھا کہ جب مرحوم بھائی کا ذکر کرتے تو ایک محویت کی طاری ہو جاتی اور سب کچھ بھول جاتے اور ان کے اوصاف و کمالات اور ان کے واقعات کا مزا لے لے کر ذکر کرتے اور فرماتے حضرت میرے بھائی ایسے تھے، خصوصیت کے ساتھ ان کی جامعیت، صحابہ کی شان، روشن اعتدال طبیعت، مختلف عناصر اور بظاہر اضداد کو جمع کرنے اور جمع رکھنے کی خداداد قابلیت، غیر معمولی ذکاوت، اور سلامت فہم کے واقعات بڑی تفصیل اور دلچسپی سے سناتے تھے، علوم میں آپ کے بعض تحقیقی کلمات اور کلیات کا حوالہ دیتے۔[1]

مولانا محمد یحییٰ صاحب کے کچھ حالات اور خصوصاً حضرت شیخ الحدیث کی زبان سے

مرزا شیا جاہ مرحوم (فرزند مرزا الٰہی بخش) کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے بڑی عقیدت اور محبت تھی اور انھوں نے مولانا سے باصرار اور بتکرار اپنی اس خواہش کا ذکر کیا کہ میں اپنی لڑکی قیصر جہاں بیگم کو نکاح عزیزی مولوی محمد یحییٰ سلمہ سے کرنا چاہتا ہوں، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب فقیر منش بزرگ تھے وہ اس شاہی خاندان سے رشتہ کیا پسند کرتے؟ ان کے شدید اصرار پر انھوں نے نو عمر صاحبزادے سے استمزاج کیا۔ انھوں نے معذرت کر دی اور جواب دیا کہ شہزادی سے نکاح کرنے کے بعد بوریئے پر بیٹھنا تو کبھی نصیب نہ ہوگا۔[2] جس کا صاحبزادی موصوفہ کو بہت قلق تھا۔

تعلیم اور تربیت کے سلسلہ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کے یہاں سب سے زیادہ زور ترک تعلقات پر تھا، ان کا مقولہ تھا کہ "آدمی چاہے کتنا ہی ذہین اور کند ذہن ہو اگر اس پر تعلقات کا

---

[1] حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ص ۴۲
[2] آپ بیتی حصہ اول ص ۱۰

مرضی نہیں تو وہ کسی وقت ذی استعداد بن کر رہتا ہے، اس کے برخلاف وہ جتنا بھی
ذی استعداد و ذہین اور علم کا شوقین ہو اگر اس کو تعلقات کا چسکہ ہے تو وہ اپنے جوہروں
کو کھو کر رہے گا۔[1] یہ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ صاحبزادگی کا زعم بہت دیر میں نکلتا ہے،
حضرت شیخ بیان کرتے ہیں کہ گنگوہ کے قیام اور اپنے بچپن میں مجھے اپنے چچا جان مولانا محمد الیاس
صاحب کو دیکھ کر طویل نوافل کا شوق ہوا، میں نے مغرب کے بعد حضرت گنگوہی قدس سرہ کے
حجرہ کے سامنے لمبی نفلوں کی نیت باندھ لی، ابا جان نے آکر زور سے تھپڑ مارا اور فرمایا کہ
سبق یاد نہیں کیا جاتا؟[2]

مولانا محمد یحییٰ صاحب کے یہاں تعلیم میں جدت تھی، ان کے یہاں درس نظامی کی پابندی
نہیں تھی، ہر شخص کی حیثیت کے مطابق کتاب تجویز ہوتی تھی، الفیہ ابن مالک کا سبق روزانہ
حفظ سنا کرتے تھے،[3] ان کے یہاں پہلے قواعد زبانی یاد کرائے جاتے تھے، اس کے بعد ان قواعد کا اجرا
تمرین، اردو کی کتابوں پر کرایا جاتا تھا، رمضان میں تعطیل نہیں ہوتی تھی، البتہ رمضان کی وجہ سے ان میں
تخفیف ہو جایا کرتی تھی، ادب پر بہت زور تھا، نحو و صرف کے ساتھ ہی عربی سے اردو، اردو
سے عربی بنوانے کا اہتمام تھا، ادب میں [illegible] کا بہت دستور تھا، ادب کی کتابوں میں
وہ بعض کتابوں کے پڑھانے کے مخالف تھے۔[4]

مولانا محمد یحییٰ صاحب مدارس کے موجودہ طرز تعلیم کے بہت خلاف تھے، فرمایا کرتے تھے
اس سے استعداد پیدا نہیں ہو سکتی، مدرس قراءت کے بجائے مطالعہ دیکھے اور حق میں سارا وقت دیا
کرے، طلبہ عظام کا احسان ہے کہ وہ سبق یاد کریں، ادھر ادھر مشغول رہیں، ان کے یہاں
سارا بار طالب علم کے اوپر رہتا تھا، وہ مطالعہ دیکھے سبق پر تقریر کرے، فرماتے تھے کہ استاد کا کام

---

[1] آپ بیتی حصہ اول ص۳۳ [2] ایضاً ص [3] ایضاً ص [4] ایضاً ص

اگر حدیث پڑھوں گا تو حضرت سے ورنہ نہیں لہٰذا حضرت گنگوہیؒ امراض کی کثرت اور بہت سے عوارض کی وجہ سے کئی سال پہلے سے حدیث کے اسباق بند فرما چکے تھے، مولانا خلیل احمد صاحب نے حدیث کے امتحان میں جو مدرسہ حسین بخش میں ہوا تھا، اور مولانا نے مطالعہ اور محنت سے اس کی تیاری کی تھی[۱] کے جوابات دیکھ کر حضرت گنگوہیؒ سے سفارش فرمائی مگر حضرت نے اعذار کی وجہ سے سبق بند کر دیئے مگر ایک سال دورہ میری درخواست پر اور پڑھا دیا کہ مولانا اسماعیل صاحب کاندھلوی ثم دہلوی کے لڑکے مولوی یحییٰ کا میں نے امتحان لیا ہے ایسا ذہین غالب علم بڑی مشکل سے ملتا ہے حضرت نے یکم ذی قعدہ سے ترمذی شریف شروع فرما دی، اس کے بعد بخاری شریف شروع ہوئی۔[۲]

حضرت سہارنپوریؒ جس دن بمبئی پہونچے، اسی دن مولانا یحییٰ صاحب کا انتقال ہوا، مولانا کے انتقال کا تار حضرت کو بمبئی میں ملا، حضرت سن کر سکتے میں رہ گئے، تین چار دن پہلے حضرت کا عدن سے تار آیا تھا کہ فلاں جہاز سے تشریف لا رہے ہیں، اس پر مولانا نے رائے پور اطلاع کا جو خط لکھا تھا اس کی ابتداء اس شعر سے کی تھی ؎

مژدہ اے دل کہ دگر باد صبا باز آمد
ہدہد خوش خبر از شہر سبا باز آمد[۳]

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی نمبر ۶ صفحہ ۱۴۶-۱۴۷ [۲] تذکرۃ الخلیل ص ۱۴۰ [۳] ایضاً ص ۱۴۱

باب دوم

پیدائش سے فراغت علمی تک[1]

ولادت و طفولیت

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے مولانا محمد یحییٰ صاحب کی شادی حافظ یوسف صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی حضرت شیخ الحدیث ۱۳۱۵ھ میں رمضان کی گیارہویں شب میں گیارہ بجے رات کو ______ کاندھلہ میں پیدا ہوئے، ولادت کی نوید ملی تو خاندانی مسجد میں خاندان کے شرفاء و بزرگ و اہل محلہ تراویح سے فارغ ہو رہے تھے اس لئے سب کے سب اپنے اپنے گھر جانے کے بجائے اس مکان پر آئے جہاں اس مبارک بچہ کی ولادت ہوئی تھی بچہ کی ولادت پر مبارکباد پیش کی پھر اپنے اپنے گھر واپس گئے۔

بچہ کے دادا حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نظام الدین دہلی میں تھے پوتے کی پیدائش کی خبر سنی تو برجستہ زبان سے نکلا کہ "ہمارا بدل آگیا" اور اسی سال شوال میں دنیا سے رحلت فرمائی۔

سوا دو برس بعد آپ کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلہ تشریف لائے گھر پہونچ کر

---

[1] اس باب کا مواد و معلومات تمام تر مصنف کے استفسارات کے جواب میں شیخ کے مکاتیب اور آپ بیتی سے ماخوذ ہیں جن سے زیادہ مستند ذریعہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

بچے کو دیکھنے کی خواہش تھا، چونکہ اس زمانہ میں قدیم خاندانوں میں بڑی حیا اور حجاب تھا، باپ
بزرگوں کے سامنے بچوں کو لینے اور ان سے اظہار تعلق کرنے میں بڑا حجاب محسوس کرتے تھے اور
اس کا دستور نہیں تھا کہ اس طرح بچہ کو دیکھنے کے لئے اجازت دی جائے، وہاں گھر میں عقیقہ کے لئے
کچھ کچھ اہتمام ہونا ضروری تھا، مستورات میں ایک نانی نے جن کا نام بی بی مریم تھا،
بچہ کے عقیقہ کے لئے بڑا شعور بنا رکھا تھا اور ان کو اپنے دل کے ارمان نکالنے کی بڑی
خوشی تھی، مولانا یحییٰ صاحب کے ایک پھوپھی نے اور بچہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کرنے سے
بھیجوں کو کہا کہ تو تعجب ہوا اور یہ بات بڑی حسرت ہوئی اور بعض نے یہ کہہ کر اپنی حیرت دور کی کہ
آخر بیٹا ہی تو ہے اگر دیکھنے کو جی چاہا تو کیا بے حیائی ہے؟ مولانا حجام اپنے ساتھ لائے تھے، بچہ آیا تو
حجام کو اشارہ کیا، اس نے بال اتر دیئے، مولانا نے بال دوات کے پاس رکھوا دیئے اور فرمایا کہ
ان کو رکھ دیا اور کہہ دیا کہ آپ ان کو رکھئے اور بال کے وزن بھر چاندی صدقہ کر دیجئے۔
بچہ کے دو نام رکھے گئے محمد موسیٰ، محمد زکریا، دوسرے نام نے شہرت عام پائی
آپ اسی سے مشہور و مقبول عوام و خواص ہوئے۔

اس وقت مولانا یحییٰ صاحب کا قیام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی
خدمت میں مستقل طور پر گنگوہ رہا کرتا تھا، حضرت کاندھلہ اور دہلی آتے جاتے تھے، شیخ الحدیث کی
عمر ڈھائی سال کی تھی کہ وہ بھی اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ گنگوہ چلے گئے، مولانا یحییٰ صاحب
کے ساتھ حضرت کا جو سرپرستانہ و مربیانہ بلکہ پدرانہ تعلق تھا[1] اس کی بنا پر اس خوش نصیب
اور نونہال سند بچہ کو جس کے لئے مستقبل میں حضرت کے کمالات باطنی کا حامل و امین اور
آپ کے علوم ظاہری کا ناشر و شارح بننا مقدر تھا، آپ کی خصوصی شفقتوں محبت کی

[1] اس کی تفصیل مولانا یحییٰ صاحب کے حالات میں گزر چکی ہے۔

نگاہوں اور مقبول دعاؤں کا جو حصہ ملا ہو وہ ہر طرح قرین قیاس ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ ابھی میں ڈھائی سال ہی کا تھا، حضرت گولر کے درخت کے نیچے چارزانو بیٹھے ہوتے تھے، میں حضرت کے پیروں پر کھڑا ہو کر حضرت سے خوب لپٹتا، فرماتے تھے کہ جب میں کچھ اور بڑا ہو گیا، راستہ میں کھڑا ہو جاتا، جب حضرت سامنے سے گزرتے تو میں بڑی قرأت سے اور بلند آواز کے ساتھ کہتا، السلام علیکم، حضرت بھی از راہ محبت و شفقت اسی لہجہ اور آواز میں جواب مرحمت فرماتے، شیخ فرماتے ہیں کہ حضرت گنگوہی کی گود میں کھیلنا، حضرت کے گھٹنوں پر پاؤں رکھنا اور گردن میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہونا، حضرت کے ساتھ عیدین کے موقع پر پالکی میں بیٹھ کر عیدگاہ آنا جانا، جس کے اٹھانے والے بڑے بڑے علماء و مشائخ ہوتے تھے، اور بسا اوقات حضرت کے ساتھ کھانا کھانا، اور حضرت کے پس خوردہ کا تنہا وارث بننا، اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔[1]

اس وقت گنگوہ صلحاء و علماء کا مرکز بنا ہوا تھا، حضرت کی تربیت باطنی اور شہرۂ آفاق درس حدیث نے طالبین صادقین اور علمائے کاملین کو دور دور سے کھینچ کر اس قصبہ میں جمع کر رکھا تھا، اور وہاں ایک ایسی روحانی و علمی فضا در و دیوار پر چھائی ہوئی تھی جس کی نظیر اس مبارک عصر میں بھی دور دور ملنی مشکل تھی،[2] شیخ کے بالکل بچپن کا وہ زمانہ جو غیر شعوری طریقہ پر اچھے برے اثرات کے جذب کرنے اور ابتدائی نقوش کے مرتسم ہونے کا زمانہ ہے اسی مبارک ماحول میں گزرا، وہ بارہ سال کی عمر تک گنگوہ رہے، اس عمر تک ان کا زیادہ تر وقت گنگوہ ہی میں گزرا، جب کبھی کسی تقریب میں شرکت کی غرض

---

[1] فضائل زبان عربی صفحہ ۲۴۔ [2] گنگوہ کے اس دور کا کسی قدر تفصیلی نقشہ "تذکرۃ الرشید" اور "حضرت مولانا محمد الیاس کی سوانح" میں ملاحظہ ہو۔

یا کسی ضرورت کے ماتحت والدہ صاحبہ کا عارضی طور پر کاندھلہ جانا ہوتا تو وہ بھی جاتے پھر گنگوہ واپسی ہو جاتی۔ خود ان کا وطن کاندھلہ ایک بڑا دینی و علمی مرکز تھا جس میں گھر کے اندر اور باہر عبادت کا ذوق، نوافل و تلاوت کا اہتمام، اہل اشراق اور مردان خدا سے وابستگی و شیفتگی، درس و مطالعہ کا انہماک، تہذیب و متانت اور وضعداری و سنجیدگی، بلند ہمتی و جفاکشی ہوا و فضا میں رچی بسی ہوئی تھی اور اس سے اس ہونہار بچہ کے حساس اور بیدار دل و دماغ کا متاثر ہونا بالکل قدرتی تھا۔ گنگوہ سے کاندھلہ جاتے ہوئے مختلف قصبات و مقامات سے خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کے بعض بے تکلف اور مخلص احباب ہم وطن اور ہم عمر موجود تھے کئی کئی روز قیام رہتا، کبھی بڈولی کے راستے سے جہاں خاندان کی قرابتیں بھی تھیں اور بعض عزیز قریب اور ہم مذاق لوگ موجود تھے جانا ہوتا، یہاں بھی کئی کئی دن تک بڑی یادگار صحبتیں رہتیں، یاران بزم اور شرکائے محفل سب بڑے مخلص، باوقار، باوضع و باکمال لوگ تھے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن میں کامل تھا، کبھی کبھی ان درمیانی منزلوں میں چار چار یا پانچ پانچ دن لگ جاتے، شیخ بڑی دلچسپی اور لطف کے ساتھ گنگوہ کاندھلہ اور راستے کے مقامات اور منزلوں کے واقعات سناتے تھے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظہ کے ساتھ ان کی قوت مشاہدہ کتنی تیز تھی اور ان مشاہدات اور گزشتہ صحبتوں نے ان کی سیرت اور ذوق کی تشکیل میں کتنا حصہ لیا تھا۔[1]

---

[1] اس زمانے کے بزرگ بچوں کی اخلاقی تربیت اور ان کے خاص طرح کے ذہنی نشوونما کے لئے بعض ایسے طریقے اختیار کرتے تھے جن پر آج کل کے ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم (جو بچے کی ہر طرح کی خواہشات کی تکمیل اور اس کو مکمل آزادی دینے کی تلقین و تبلیغ کرتے رہتے ہیں) عجیب عجیب ہوں گے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

شیخ آٹھ سال کے تھے کہ ۲۳ رجادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ کو حضرت گنگوہیؒ نے وفات پائی
اور وہ آفتاب رشد و ارشاد غروب ہوا جس نے گنگوہ کی سرزمین کو مطلع انوار بنا دیا تھا اور
جس کی وجہ سے اس چھوٹے سے قصبہ کو یہ مرکزیت و مقبولیت حاصل تھی حضرت کی وفات پر
علماء و صلحاء جو بڑی تعداد میں جمع تھے، متفرق ہو گئے لیکن مولانا محمد یحییٰ صاحب جنھوں نے
حضرت کو اپنے والدین پر اور گنگوہ کو اپنے وطن پر ترجیح دی تھی وہیں پڑے رہنے کا فیصلہ کیا
اور بدستور وہیں مقیم رہے۔

تعلیم کا آغاز

اس زمانہ کے اکثر قدیم گھرانوں اور شرفاء کے خاندانوں میں رواج تھا کہ ۴ سال
کی عمر میں بچہ مکتب بٹھا دیا جاتا تھا اور اس کی تسمیہ خوانی ہو جاتی۔ شیخ کے والد مولانا محمد یحییٰ
صاحب کا معاملہ تو اور بھی خصوصی تھا۔ خود شیخ کی روایت کے مطابق جب دودھ چھوٹا تو
پاؤ پارہ حفظ تھا، اور سات برس کی عمر میں قرآن مجید کا حفظ مکمل ہو چکا تھا لیکن شیخ کی
سات برس کی عمر تک بسم اللہ بھی نہیں ہوئی۔ بچہ کا نشو و نما اور اٹھان اچھا تھا، اس عمر تک

(باقی حاشیہ کا) محمد یحییٰ صاحب کو خاص طور پر اس کا اہتمام تھا۔ شیخ نے بتایا کہ ایک مرتبہ جب میری عمر ۵ سال کی تھی
والد صاحب نے کاندھلہ بھیجنے کا وعدہ فرمایا، میں خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا تھا۔ وہاں جانے کے دن گننے
لگا اور جیسے کے جانے کا دن قریب آتا اس کا انتظار کرنے لگا۔ چند دن کے بعد والد صاحب نے یہ ارادہ ملتوی فرما دیا۔ مجھے
اس پر تعجب بھی ہوا اور ملال بھی۔ ایک روز فرمایا کہ تجھے کاندھلہ جانے کی بے حد خوشی تھی اور تجھ پر اس کا شوق
اتنا غالب آگیا کہ میں نے اسی وجہ سے اس کو ملتوی کر دیا کہ اس پر اتنا خوش ہونا، اور اس کا اتنا شوق ہونا
ٹھیک نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی نمبر ۲ صفحہ ...)

تعلیم شروع نہ ہونے پر خاندان کے بزرگوں کو تعجب تھا، دادی صاحبہ نے (جو خود حافظ قرآن تھیں) ایک مرتبہ اپنے لائق فرزند سے فرمایا کہ یحییٰ اولاد کی محبت میں اندھے تمہیں ہوئے تو نے تو سات سال کی عمر میں حفظ کر لیا تھا، یہ اتنا بڑا ایسے ہی پھر رہا ہے، آخر اس کا حفظ کب کرایا جائے گا؟ مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ جب تک کھیلے اس کو کھیل لینے دیجئے جس دن یہ کولھو میں جتے گا قبر ہی میں دم لے گا۔"

بالآخر وہ مبارک دن آیا کہ بچے کی بسم اللہ ہوئی، گنگوہ قیام تھا، اس زمانہ میں مظفر نگر کے ایک نیک صالح بزرگ ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مقیم تھے جن کے ساتھ مولانا محمد یحییٰ صاحب کی بڑی نشست و برخواست رہتی تھی، ڈاکٹر صاحب کے گنگوہ کے قیام کا ایک ہی مقصد معلوم ہوتا تھا اور وہ حضرت گنگوہی کی خدمت تھی، مولانا محمد یحییٰ صاحب نے بچہ کو انھیں کے یہاں پڑھنے کے لئے بٹھایا اور شیخ نے قاعدہ بغدادی انھیں سے ختم کیا۔

قرآن مجید کا حفظ اس خاندان کا خصوصی شعار اور تعلیم کا پہلا ضروری مرحلہ تھا، اسی کے مطابق حفظ کا سلسلہ شروع کرایا گیا، مولانا محمد یحییٰ صاحب کا تعلیم و تربیت میں نرالا ہی دستور تھا، وہ ایک صفحہ کا سبق دے دیتے اور فرماتے کہ اس کو سو مرتبہ پڑھو اور پھر دن بھر چھٹی ہے، فطرت انسانی اور تقاضائے عمر سے بڑے سے بڑا ہونہار بچہ (خصوصاً جس میں ذہانت کا جوہر بھی ہو) مستثنیٰ نہیں ہوتا، شیخ فرماتے ہیں کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک صفحہ سو مرتبہ پڑھنے میں کتنا وقت لگتا ہے، میں بہت جلدی آکر کہہ دیتا کہ سو مرتبہ پڑھ لیا، والد صاحب اس پر کچھ زیادہ جرح قدح نہ فرماتے، اگلے دن کہتا کہ کل تو کچھ یونہی سا پڑھا تھا، آج ٹھیک ٹھیک سو مرتبہ پڑھا ہے، فرماتے کہ آج کے سچ کی حقیقت تو کل معلوم ہوگی، سپارہ پورا ہو جانے اور عربی شروع ہو جانے کے بعد بھی یہ حکم تھا کہ ایک پارہ کو اتنی مرتبہ پڑھو، مغرب کے بعد

ایک صاحب اس کو سنتے تھے اس میں خوب غلطیاں نکلتی تھیں اس پر سہارنپور کے مشہور رئیس مولوی عبداللہ جان صاحب نے جن کو اس خاندان سے بڑا گہرا تعلق تھا، مولانا محمد یحییٰ صاحب سے ایک روز کہا کہ زکریا کو قرآن یاد نہیں، مولانا نے فرمایا کہ بالکل نہیں انھوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ فرمایا کہ اسے عمر بھر کرنا ہی کیا ہے، قرآن ہی پڑھنا ہے یاد ہو جائے گا۔

۱۳۲۸ھ تک یعنی ۱۲-۱۳ سال کی عمر تک گنگوہ قیام رہا، اس عرصہ میں اردو کے دینی رسائل بہشتی زیور وغیرہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گنگوہ میں رہ کر پڑھیں جو زیادہ تر شفیق اور بزرگ چچا مولانا محمد الیاس صاحب نے پڑھائیں۔

مولانا محمد الیاس صاحب کے یہاں سبق اس طرح ہوتا کہ سبق میں ایک بھی سوال کی مار تھا، ناش غلطی پر کتاب بند کر دیتے فرماتے زکریا اگر تو چپ رہے تو میں تجھے دلی کر دوں، شیخ فرماتے تھے میں سمجھتا تھا کہ دلی کر دینا بھی چپ رہنا مصیبت ہے۔

سہارنپور کا قیام اور عربی تعلیم کا آغاز

عربی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ سہارنپور آکر ۱۳۲۸ھ میں شروع ہوا، مولانا محمد یحییٰ صاحب زندگی کے اکثر شعبوں بالخصوص تعلیم کے مسئلہ میں مجتہدانہ ذوق رکھتے تھے وہ مروجہ نصاب اور عام طریقۂ تعلیم اور درسی کتابوں کی متعارف ترتیب کے خلاف تھے انھوں نے اپنی تجویز اور تجربہ، ذہانت اور خداداد ملکۂ تعلیم کی مدد سے خود ایک نصاب تجویز کر رکھا تھا، مولانا محمد الیاس صاحب کا بھی عمل اسی پر تھا، شیخ کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی اسی اجتہاد و انتخاب سے کام لیا گیا، ان کا دستور تھا کہ وہ بغیر کتاب کے زبانی تعلیم دلواتے تھے اس کے بعد وہ چار حرف بنا کر مثال، اجوف، ناقص، مضاعف چاروں کے صیغوں پر بیٹھ کر چھینے نہ بنے

خاص اصول اور طریقہ تھا، ان کے یہاں استاد کے خود تقریر کرنے اور سارے مطالب کو خود
حل کر کے دے دینے کا دستور نہ تھا جیسا کہ اس وقت بڑے بڑے عربی مدرسوں میں رواج ہو گیا
ہے کہ استاد شرح و بسط کے ساتھ تقریر کرتے ہیں اور مطالب کے حل کرنے کی ساری ذمہ داری
انھیں پر ہوتی ہے طلبہ کی حیثیت صرف سامع اور شریک مجلس کی ہوتی ہے، مولانا کے یہاں
طالب علم کا مطالعہ کر کے سبق کو پورے طور پر حل کر کے لانے کی پابندی تھی، وہ صرف وہیں
رہنمائی اور مدد فرماتے تھے جہاں طالب علم کی قوت مطالعہ اور فہم کی رسائی نہ ہو اور شرح
و حواشی سے مدد نہ ملتی۱؎، اسی لئے ان کے یہاں اہمیت کتاب کے حرفاً حرفاً ختم کرنے کے بجائے
کتاب کے مطالب اور موضوع پر حاوی ہو جانے اور مطالعہ میں ملکہ پیدا ہو جانے کی تھی،
اور جس وقت ان کو اطمینان ہو جاتا تھا، وہ کتاب کو بسم اللہ سے تاء تمت تک
ختم کرانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور دوسری کتاب شروع کرا دیتے تھے۔

اس زمانہ میں مولانا امجد علی صاحب۲؎ کی معقولات کے درس و تعلیم میں خاص شہرت
تھی انھوں نے معقولات کی اعلیٰ کتابیں خیرآبادی اساتذہ سے بڑی تحقیق و محنت سے
پڑھی تھیں اور ان کو معقولات کی تعلیم میں بڑا درک اور انہماک تھا، دور دور سے لوگ آ کے
منطق و فلسفہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھنے مینڈھو ضلع علی گڑھ وغیرہ جایا کرتے تھے مولانا امجد علی صاحب

۱؎ ایک اساتذہ کا بڑا تجربہ تھا اور اس وقت تک کے تجربوں اور تعلیمی نظریات کے مطابق یہی بہترین اصول تعلیم ہے۔

۲؎ مولانا امجد علی صاحب نواکاؤں ضلع جونپور کے تھے، درسیات خصوصاً معقولات کی تعلیم مولانا عبد الحق صاحب
خیرآبادی سے پائی، حدیث گنگوہ جا کر پڑھی، مینڈھو ضلع علی گڑھ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں عرصہ تک مدرس رہے
علوم عقلیہ و کتب عقلی کے درس و تدریس میں نامور اور مرجع طلبہ تھے، [illegible] عید الفطر کے دن وفات
پائی اور اپنے وطن میں مدفون ہوئے۔

حدیث حضرت گنگوہیؒ سے پڑھی تھی، اس دور میں مولانا محمد یحییٰ صاحب ان کے رفیق تھے اور دونوں میں بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی، اس تعلق کی بنا پر اور کچھ شیخ کی غیر معمولی ذہانت اور علمی مناسبت دیکھ کر انھوں نے مولانا محمد یحییٰ صاحب سے فرمایا کہ شیخ کو ایک سال کے لئے ان کے حوالہ کر دیا جائے، وہ ان کی معقولات کی تکمیل کرا دیں گے، یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے امید ہے کہ وہ بخاری شریف بھی مجھی سے پڑھنے کی خواہش کرے گا، لیکن اس کی نوبت نہ آئی اور شیخ کو اپنی تعلیمی تکمیل اور حصول علم کے لئے سہارنپور سے کہیں باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

تعلیم میں انہماک و یکسوئی

مولانا محمد یحییٰ صاحب کو تعلیم سے کہیں زیادہ تربیت کا اہتمام تھا[1]، ان کے یہاں پڑھنے

---

[1] مولانا محمد یحییٰ صاحب کی تربیت کے نرالے انداز اور ان کی ذہانت و سلامت فہم کے عجیب اتفاقات میں یہاں پر ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے، جب شیخ کی نحو کی تعلیم شروع ہوئی تو اس افتتاح کے موقع پر مولانا نے شیخ کو بیس روپے عطا فرمائے، پھر ارشاد فرمایا کہ ان کا کیا کرو گے؟ شیخ نے جواب دیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اکابر اربعہ سہارنپوری، دیوبندی، رائے پوری، تھانوی کی خدمت میں پانچ پانچ روپے کی مٹھائی پیش کر دوں، بڑی مسرت کے ساتھ اس کی تصویب فرمائی، پھر دریافت فرمایا کہ کون سی مٹھائی؟ شیخ نے متفرق مٹھائیوں کے نام لئے، فرمایا لاحول ولا قوۃ، ان میں سے کون ایسا ہے جو مٹھائی کھاتا ہو، تمہاری مٹھائی میں ایک آدھ ڈلی چکھ لیں گے، باقی سب دوسروں کی نذر ہو جائے گی، ایسا کرو کہ پانچ روپے کی مصری اور شکر خرید کر حضرات کی خدمت میں پیش کر دو، ایک ہفتہ تک تمہاری ہی مصری کا جی چاہے نوش فرمائیں گے، چنانچہ تعمیل کی گئی، حضرات اکابر ثلاثہ کی خدمت میں پانچ پانچ روپے نقد مع خط اور ان میں پیش کر دیئے گئے، سب حضرات نے بڑی مسرت سے قبول فرما کر دعائیں دیں۔

اور محنت کرنے سے زیادہ اس بات کی نگرانی ہوتی تھی کہ شیخ کسی لڑکے یا اپنے کسی رفیق، یا کسی نوجوان کے ساتھ بے تکلف نہ ہوں، اور کسی سے ان کا اختلاط نہ ہونے پائے، اس پر ان کی بڑی کڑی نگاہ رہتی تھی کہ شیخ کسی سے ہنستے بولتے یا کسی ساتھی یا اہل محلہ سے راہ و رسم تو نہیں پیدا کرتے، راستہ چلتے اگر کوئی ان کو خصوصیت کے ساتھ سلام کرتا، یا ایک نماز سے زیادہ نمازوں میں کوئی ہم عمر یا نوجوان دو ایک بار ان کے برابر کھڑا ہو جاتا تو اس پر جواب طلب ہو جاتا، اور تنبیہ کی نوبت آتی، اس وقت سے شیخ بھی اس کی بڑی احتیاط رکھتے، اور سب سے الگ تھلگ اپنے کام میں مشغول رہتے، مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کی احتیاط اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اپنے یا مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ہمراہی کے بغیر مدرسے باہر جانے یا مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی سیر و تفریح کا شوق پیدا نہ ہوا اور وہ طبیعت ثانیہ بن گئی، سہارنپور میں بڑے بڑے جشن کا موقع آتا اور نمائش ہوتی، آپ والد صاحب کی اجازت کے باوجود اس میں شریک نہ ہوتے، یہ یکسوئی اور تنہائی پسندی اتنی بڑھی کہ ایک مرتبہ مدرسہ قدیم سے چھ مہینے تک باہر جانے کی نوبت نہ آئی۔[1]

---

[1] مدرسہ قدیم میں ابتداء سے سب ضروریات کا انتظام ہے، مدرسہ، کتب خانہ، مسجد، غسل خانہ اور بیت الخلاء سب موجود ہیں، بیت الخلاء کے لئے کیواڑ کے پیچھے لوٹے بھی پڑے رہتے ہیں، اس طرح بعض اوقات شیخ کو ہفتوں اور مہینوں اپنا جوتا استعمال کرنے یا نیا جوتا خریدنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی۔

شیخ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میرا نیا جوتا مدرسہ سے کسی نے اٹھا لیا تو تقریباً چھ ماہ تک مجھے دوسرا خریدنے کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ اس مدت میں مجھے مدرسے سے باہر قدم نکالنے کی نوبت ہی نہیں آئی، مدرسہ کی مسجد میں جمعہ ہوتا تھا، اور مدرسہ کے بیت الخلاء میں ایک دو لوٹے کسی کے پڑے رہ جاتے ہیں یا رو مال رہتا ہی ہے کیونکہ دستور ہے اس وجہ سے مجھے کسی ضرورت کے واسطے بھی مدرسہ کے دروازے سے باہر قدم رکھنا نہ ہوا، ضرورت ہوئی ہی۔ (الاعتدال ص ۱۳۱-۱۳۲)

حدیث کا آغاز

بالآخر وہ مبارک دن اور وہ مبارک ساعت آئی کہ اس علم کی تعلیم کا آغاز ہوا جس کے دامن سے ساری عمر وابستہ رہنے اور اسی کی خدمت کے لئے وقف ہوجانے کا فیصلہ قضا و قدر میں ہوچکا تھا، اور جس کی نسبت پیدائشی نام پر اس طرح غالب ہوکر رہنے والی تھی کہ شیخ الحدیث نام کا قائم مقام اور نام سے بھی زیادہ مشہور ہوا۔ اس دن حدیث کے خادموں اور اس کے ناشرین اور شارحین کی صف میں ایک وقیع اضافہ ہونے والا تھا، اور کیا عجب ہے کہ اس "نو وارد" کی آمد پر اس فن اور اس کے مخلص خدمت گزاروں کی روح نے کہا ہو کہ ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

اس سلسلہ کا آغاز بھی بڑے اہتمام کے ساتھ ہوا، محرم سنہ ۱۳۳۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، پہلے مولانا محمد یحییٰ صاحب نے غسل فرمایا، پھر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کرائی، خطبہ پڑھا، پھر رو بقبلہ ہوکر دیر تک دعا کی، شیخ فرماتے ہیں کہ یہ تو نہیں معلوم ہوسکا کہ والد صاحب نے کیا کیا دعائیں کیں، لیکن میری ایک ہی دعا تھی اور وہ یہ کہ حدیث کا سلسلہ دیر میں شروع ہوا، خدا کرے کبھی چھوٹے نہیں۔[1]

مولانا محمد یحییٰ صاحب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے شاگرد تھے کہ استاد کو بھی اپنے اس شاگرد پر ناز تھا، حضرت کے عمیق مطالعہ، تبحر، فہم اور خصوصی تعلیقات علیہ کے سوا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے ان کو قلم بند بھی کیا، اور ان کی شرح و وضاحت بھی فرمائی، وہ اپنی

---

[1] اس دعا کی قبولیت کے آثار سب کے سامنے ہیں، حیات و حالات بیان [2] ملاحظہ ہو ترمذی کی تقریر درس (تعلیقات) موسوم بہ "الکوکب الدری" اور بخاری کی تعلیقات معروف بہ "لامع الدراری"۔

خداداد علمی مناسبت و ذکاوت، فنِ حدیث سے شغف و انہماک، اور اپنی نکتہ رس طبیعت اور ذوقِ سلیم کی وجہ سے حدیث کی تدریس اور (فقہ و حدیث کی تطبیق میں) خاص مقام رکھتے تھے، اور ان کے شاگرد رشید ان کے درس کے بعد کم کسی کے درسِ حدیث کے قائل ہوتے تھے۔

دورۂ حدیث

۱۳۲۸ھ میں دورۂ حدیث کی ابتدا ہوئی یہی سال تھا جب حضرت سہارنپوری نے طویل قیام کے ارادہ سے حجاز کا قصد کیا، شیخ کا خیال تھا کہ مجھے نہ ملازمت کرنی ہے اور نہ کوئی عجلت ہے ایک سال میں دورۂ حدیث مکمل کرنے کی کوئی پابندی نہیں اس لئے اپنے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب کے درس میں ابوداؤد شروع کردی، ترمذی شریف کو حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی واپسی پر ملتوی رکھا تھا لیکن بعض اسباب کی بناء پر ترمذی، بخاری اور (ابن ماجہ کے سواء) بقیہ کتب صحاح والد صاحب ہی سے پڑھیں، یہ سال بڑی محنت اور انہماک کا تھا اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کوئی روایت بھی بے وضو نہ پڑھی جائے مسلسل پانچ چھ گھنٹے سبق ہوتا تھا اس میں کبھی کبھی بعض مرتبہ سبق کے درمیان وضو کی ضرورت پیش آتی تھی اور اتنی دیر کے لئے اٹھنا ہوتا تو ہم درس و ہم مذاق رفیق کوشش کرتے کہ حرج نہ ہو اور سبق آگے نہ بڑھنے پائے۔

حضرت سہارنپوری سے بیعت

شوال ۱۳۳۳ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب طویل قیام کے ارادہ سے حجاز کا

تصور فرماتے تھے اور لوگ کثرت سے بیعت ہوتے تھے، شیخ فرماتے ہیں کہ بچوں کی طرح سے
دیکھا دیکھی اپنے اندر بھی جذبہ پیدا ہوا، حضرت سے عرض کیا، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ جب
میں مغرب کے بعد نفلوں سے فارغ ہو جاؤں، اس وقت آجانا، مولانا عبید اللہ صاحب گنگوہی
جو خلافت سے سرفراز ہو چکے تھے، انھوں نے بھی تجدید کی درخواست کر رکھی تھی، حضرت نے
فراغت کے بعد دونوں کو قریب بلایا، اور اپنے دونوں ہاتھ دونوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیئے
اور بیعت کے الفاظ کہلوانا شروع کئے، مولانا عبید اللہ صاحب نے ہچکیوں کے ساتھ دھاڑیں
مار کر رونا شروع کیا، جس کا اثر حضرت پر بھی تھا، حضرت کی آواز بھرا گئی، اس وقت مولانا
محمد یحییٰ صاحبؒ اور حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اوپر بیٹھے ہوئے
تھے، وہ یہ آواز سن کر منڈیر پر دیکھنے کے لئے آئے، دیکھا تو شیخ بھی بیعت ہو رہے ہیں، اس پر
مولانا کو تعجب اور احساس ہوا کہ بلا علم و اطلاع کے انھوں نے اتنا بڑا کام کر لیا، لیکن
حضرت رائے پوریؒ نے اس جرأت کی بڑی تصویب فرمائی، اور بہت دعائیں دیں۔

مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کی وفات پر شیخ کی بلند ہمتی

باکمال مشفق و مربی والد ماجد کی وفات کے سانحۂ عظیم کو شیخ نے اپنی نو عمری کے باوجود
ضبط و تحمل اور قوت ایمانی سے نہ صرف برداشت کیا، جو اہل یقین اور اصحاب نسبت کی
شان ہے، بلکہ پورے خاندان اور عزیز وہ گھر کے لئے تسکین و تقویت کا ذریعہ بن گئے، مولانا
نے آٹھ ہزار کا قرض چھوڑا تھا، شیخ نے اس موقع پر بڑی مردانگی اور بلند ہمتی کا ثبوت دیا،
جن کا بھی علم ہو سکا، ان کو فوراً خطوط لکھ دیئے کہ مرحوم قرضہ سے بری ہیں، وہ قرضہ
میرے ذمہ ہے، اس وقت شیخ کی عمر انیس ۱۹ سال کی تھی، عام طور پر سب قرض خواہوں کو

قدرتاً یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ رقم ضائع ہو جائے گی اس لئے بہت شدت سے مطالبے شروع ہو گئے، بیچ ایک سے لے کر دوسرے کو ادا کر دیتے تھے، یہ سال بہت شدت کا گزرا۔ مولانا مرحوم کا قرض تو دو تین مہینے میں ختم ہو گیا، اور وہ اس سے بالکل سبکدوش ہو گئے، البتہ شیخ مقروض ہو گئے، ۱۳۳۵ھ تک اس قرضہ کا جو مولانا کے قرض کی ادائے گی میں ہو گیا تھا، ایک ہزار شیخ کے ذمہ باقی تھا جس کی ادائیگی ۱۳۳۸ھ میں حج کے سفر کے موقعہ پر مولوی نصیر الدین صاحب کے حوالہ کر کے گئے، جو اس وقت ناظم کتب خانہ تھے۔

طالب سے زیادہ مطلوب

ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے انتقال فرمایا تو صدمہ کی شدت اور محبت کے جذبہ سے لائق فرزند کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بس اب دوبارہ بخاری و ترمذی پڑھنے کی ضرورت نہیں، لیکن حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے واپسی پر حکم فرمایا کہ ترمذی و بخاری دوبارہ پڑھنی ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ طبیعت بالکل نہیں چاہتی تھی، لیکن انکار کی کوئی صورت نہ تھی، اسی دوران میں خواب دیکھا کہ حضرت شیخ الہند، مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے بخاری پڑھ لو، سوچتا رہا کہ حضرت اس وقت مالٹا میں اسیر ہیں، ان سے پڑھنے کہاں جاؤں؟ حضرت نور اللہ مرقدہ نے خواب سنا تو فرمایا کہ اس کی تعبیر یہی ہے کہ مجھ سے دوبارہ پڑھو۔

بالآخر حضرت کے یہاں کتابیں شروع ہوئیں، یہ سال انتہائی انہماک کا دور تھا، فرماتے ہیں جہاں تک مجھے یاد ہے شب و روز میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ سونا نہیں ہوتا تھا، ساری رات شروح حدیث کا مطالعہ کرتے اور سبق میں پورے طور پر تیار ہو کر جاتے

اس محنت و انہماک اور فطری سعادت اور خوش بختی نے حضرت کی نظر انتخاب کو متوجہ کیا اور وہ تقریب پیدا ہوئی جو شیخ کامل کے قرب و اختصاص اور استاذ فاضل کے انتخاب و اعتماد کی موجب ہوئی، اور اس سے شیخ کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جو ان کے مستقبل کی کامیابیوں اور اقران و اماثل میں خصوصیت و امتیاز کا راز ہے۔

"بذل المجہود" کی تالیف میں اعانت و شرکت

درس میں شرکت کو دو مہینے گزرے تھے، حضرت ایک دن سبق پڑھا کر دار الطلبہ مدرسہ قدیم آرہے تھے، شیخ حسب معمول ساتھ تھے، راستہ میں ایک جگہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا:۔

"ابوداؤد پر ہمیشہ کچھ لکھنے کی خواہش رہی، تین مرتبہ شروع کر چکا ہوں لیکن مشاغل کے ہجوم نے چلنے نہ دیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی حیات میں بار بار تقاضا کیا، یہ بھی چاہتا رہا کہ کسی طرح لکھ لوں اور جو اشکال ہو حضرت قدس سرہ سے حل کرا لوں، حضرت کے وصال کے بعد یہ جذبہ سرد ہو گیا، لیکن پھر یہ خیال ہوا کہ ہمارے مولوی یحییٰ تو حیات ہیں، ان سے بحث و مباحثہ کرتے رہیں گے مگر ان کی وفات پر یہ ارادہ بالکل ختم ہو گیا تھا، اب مجھے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اگر تم دونوں میری مدد کرو تو میں شاید لکھ لوں۔"

شیخ نے بے ساختہ جواب دیا کہ "حضرت ضرور شروع کریں" اور یہ میری دعا کا اثر ہے۔" حضرت نے فرمایا، کیسی دعا؟ شیخ نے کہا کہ میں نے مشکوٰۃ شروع کرتے وقت یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا ہے، یہ اب مجھ سے چھوٹے نہیں مگر اس کو

لہ یعنی شیخ الحدیث اور ان کے رفیق قدیم مولوی حسن احمد مرحوم جو علاقہ کہالہ پار سہارنپور کے رہنے والے تھے اور نہایت خاموش، متین اور نجیب و مسکین طبع نوجوان تھے، جوانی ہی میں انتقال ہو گیا، رحمہ اللہ۔

میں مجالات سے بچتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ اگر میں پڑھنے کے بعد مدرس بھی ہوگیا تو حدیث کے نہ معلوم کتنے سال میں پہونچوں گا، اس لئے کہ قدیم مدرسین جو کئی سال سے پڑھارہے ہیں ان کو حدیث ابھی تک پڑھانے کی نوبت نہ آئی۔ اب صورت یہ بن آگئی حضرت کی شرح میں اس ناکارہ کا اشتغال رہے گا، جب تک وہ مکمل ہو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ حدیث کی تدریس تک پہونچادے۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کا ہے یہی شرح بذل المجہود کی ابتداء ہے۔

حضرت نے اسی وقت شرح حدیث کی ایک لمبی چوڑی فہرست بتادی، اور کتب خانہ سے لینے کا حکم فرمادیا۔

باب سوم

تدریس و تصنیف، چند نازک امتحانات، اجازت و تکمیل

تدریس پر تقرر

یکم محرم ۱۳۳۵ھ کو حضرت شیخؒ کا بحیثیت مدرس مدرسہ مظاہر العلوم میں تقرر ہوا، اور ۱۵ روپے[1] تنخواہ مقرر ہوئی۔

ابتداءً دو سبق (اصول الشاشی جو پہلے مولانا محمد الیاس صاحب کے یہاں ہوتی تھی اور علم الصیغہ جو مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے پاس تھی) منتقل ہو کر آئے، اس کے علاوہ چار پانچ سبق نحو و منطق اور فقہ اور عربی کی ابتدائی کتابوں کے تھے، اس وقت شیخ کی عمر

---

[1] اس زمانہ کے قدیم مدارس میں تنخواہوں کا معیار آج سے بہت مختلف تھا خصوصاً ابتدائی مدرسین کی تنخواہیں اتنی کم ہوتی تھیں جو آج کل کے لوگوں کے قیاس میں مشکل سے آئیں گی چنانچہ مولانا منظور احمد صاحب کو جو ایک مدرسہ کے بڑے اساتذہ میں سے ہوئے ابتدائی تنخواہ للعہ روپے تھی اور بہت عرصہ کے بعد وہ ۳۰ تک پہونچے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ میری (۱۵ کی) تنخواہ پر سب کی انگلیاں اٹھتی تھیں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس اللہ سرہ نے جو مدرسہ کے سرپرستوں میں سے تھے بحیثیت سرپرست کے فرمایا کہ شیخ یحییٰ صاحب کے انتقال کے بعد جو بار ہے اس کے لحاظ سے یہ تنخواہ کم ہے کم سے کم پچیس ۲۵ روپے ہونی چاہئے لیکن شیخ نے فرمایا کہ جب اللہ توفیق دے تو یہ تنخواہ چھوڑ دینا، چنانچہ شیخ نے اس پر عمل کیا اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تین سال تھی مدارس کی روایات اور دستور کے لحاظ سے ان کو اصول الشاشی گویا قبل از وقت مل گئی تھی، لیکن بہت جلد شیخ نے اپنی محنت، ذہانت اور مطالعہ و تیاری سے اپنی غیر معمولی اہلیت اور استحقاق کا ثبوت دیا، اور طلبہ اتنے مطمئن اور گرویدہ ہوئے کہ انھوں نے پڑھا ہوا حصہ بھی شیخ سے دوبارہ پڑھنے کی خواہش کی۔

اگلے تعلیمی سال شوال ۱۳۳۵ھ میں پہلے سال سے اونچی اور درسی و فنی لحاظ سے اہم کتابیں پڑھانے کو ملیں، تیسرے سال شوال ۱۳۳۶ھ میں مقامات حریری اور سبع معلقہ بھی درس میں آگئے، سبعہ معلقہ منتظمین نے بڑے شک و تذبذب کے ساتھ دیا تھا، اس جماعت میں وہ طلبہ بھی تھے، جو حدیث کے بعض اسباق میں شیخ کے ہم درس رہے تھے، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد مدرسہ کے قابل احترام اور مخلص ناظم مولانا عنایت الٰہی صاحب نے ان لفظوں میں شیخ کی کامیابی کا اعتراف کیا کہ "مولوی زکریا! تم نے تو میری آنکھیں نیچی کر دیں" سنہ ۱۳۳۷ھ میں ہدایہ اولین، حماسہ وغیرہ اور رجب ۱۳۴۱ھ میں بخاری شریف کے تین پارے بھی حضرت سہارنپوری کے حکم و اصرار سے منتقل ہو کر آگئے، اور ان کے پڑھانے میں بھی شیخ سے غیر معمولی اہلیت، قوت مطالعہ اور فنی مناسبت کا اظہار ہوا، اس کے بعد آپ کو مشکوٰۃ مل گئی، سنہ ۱۳۴۴ھ تک مشکوٰۃ آپ کے زیر درس رہی۔

بذل المجہود کے کام کا انہماک اور حضرت سہارنپوری کی خصوصی شفقت و اعتماد

شیوخ کاملین سے استفادہ اور باطنی ترقیات میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ ان کی مفوضہ خدمت کی تکمیل اور ان کے ذوقی مشغلہ میں (جو ان کو دل و جان سے عزیز ہوتا ہے) تنہائی، خود فراموشی اور جانکاہی سے رفاقت و اعانت کی جائے، اہل بصیرت

نزدیک ایک مسترشد کو اس سے اپنے شیخ کی جو محبوبیت و اعتماد حاصل ہوتا ہے اور اس
سے باطنی ترقیات سے حاصل ہوتی ہیں اور جن محنت کے ساتھ سلوک کے مدارج طے ہوتے
ہیں وہ عام طور پر کسی اور ذریعہ سے اور بعض اوقات بڑے بڑے مجاہدات سے بھی طے نہیں
ہوتے۔ اسی زمانہ میں حضرت سہارنپوری بذل المجہود کی تالیف کی طرف متوجہ تھے
اور اس کی تکمیل کا جذبہ اور تقاضا ہر چیز پر غالب تھا۔ یہ شیخ کی بڑی خوش قسمتی اور ان کی
ساتھ ان کی بڑی ذہانت اور حقیقت شناسی تھی کہ انہوں نے اپنے کو اس کام کے لئے
وقف کر دیا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بے تعلق ہو کر اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ
اس میں لگ گئے۔ تالیف کا طریقہ یہ تھا کہ حضرت شیخ حدیث اور آخذ کی نشاندہی
فرما دیتے، شیخ ان کا مطالعہ کر کے متعلقہ مواد جمع کر دیتے اور حضرت کی خدمت میں اس کو
پیش فرما دیتے، حضرت اپنے الفاظ میں اس کو منتخب و مرتب کر کے مصنفانہ حیثیت سے
لکھواتے، تسوید اور تحریر کا یہ کام شیخ انجام دیتے، اس تحریر میں حضرت کا قرب و اختصاص
روز بروز بڑھتا چلا گیا۔

فطرت انسانی کے مطابق اس چیز نے شیخ کے ہم عمروں اور ان نوجوان علماء کے
مدرسین کے دل میں رشک و منافست کا جذبہ پیدا کیا جو حضرت کا قرب و اختصاص
چاہتے تھے، ان میں سے بعض حضرات نے کہا کہ اس خصوصیت سے تدریس پر اثر پڑتا ہے
اس لئے کسی اور کو یہ کام سپرد ہونا چاہیے جس پر تدریس کا بار نہ ہو اور وہ مدرسہ
کا ملازم ہو، چنانچہ ایک دوسرے صاحب اس کام کے لئے مقرر ہوئے لیکن جن کو
مقرر کیا گیا وہ جلدی جلدی گھر جاتے تھے، حضرت کو اس سے گرانی ہوئی، اس پر شیخ نے
کچھ ایسی باتیں کہیں جن پر کشیدگی ہوئی، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میرا کام دوسرے سے نہیں چلتا۔

اس طرح وہ خدمت پھر شیخ کے سپرد ہو گئی، دوسری مرتبہ تسوید و تحریر کے لئے ایک ایسے صاحب کو مقرر کیا گیا جو زیادہ خوش خط تھے لیکن کاپی نویس نے کہہ دیا کہ مجھے شیخ کے خط سے نقل کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں نقطوں وغیرہ کا اہتمام رہتا ہے اس طرح گھوم پھر کر یہ خدمت شیخ ہی کے پاس آگئی۔

شیخ نے اس عرصہ میں سوائے شدید مجبوری کے ہر طرح کے سفر، نقل و حرکت، اور ہر اس چیز سے جس سے اس کام میں حرج واقع ہو گریز کیا، ان کو پہلے بھی سفر سے وحشت اور عدم مناسبت تھی، اس زمانہ تالیف میں تو انھوں نے اپنے کو گویا بالکل پابہ زنجیر بنا لیا، بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض بزرگوں اور عزیزوں کے اصرار سے حضرت نے کسی سفر میں اپنے ساتھ لے لیا، شیخ نے موقعہ دیکھ کر راستے میں عرض کیا کہ اگر اس سفر میں ہم رکاب رہا تو بذل کی کاپیوں کی تصحیح میں حرج واقع ہوگا، اس لئے راستہ ہی سے واپسی کی اجازت دی جائے، حضرت نے یہ سن کر بخوشی اجازت دے دی، اور شیخ راستہ ہی کے کسی اسٹیشن سے واپس آگئے۔

جب بذل کی طباعت کا مرحلہ شروع ہوا تو پہلے اس کا انتظام میرٹھ میں کیا گیا، اس کے بعد تھانہ بھون میں مولانا شبیر علی صاحب کے پریس میں اس کو منتقل کر دیا گیا، اس وقت شیخ کا معمول تھا کہ جمعرات کی شام کو تھانہ بھون جاتے، اور سنیچر کی صبح کو واپس آتے، یہ سفر ہر ہفتہ یا پندرہ دن میں ایک مرتبہ پیش آتا، اس میں کبھی جو اتوار کو پریس کی چھٹی نہ ہوتی تو ایک آدھ دن بڑھ جاتا، عرصہ تک یہ معمول رہا، اس کے بعد ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک دہلی کے ہندوستانی پریس میں طباعت کا کام ہوتا رہا، اس زمانہ میں اکثر ہفتہ وار اور کبھی پندرہ دن میں دہلی جانا ہوتا تھا، جمعہ کی شب میں بارہ بجے کی گاڑی سے روانہ ہوتے

بارہ بجے تک اپنا کام کرتے پھر تنہا پیادہ پا اسٹیشن جاتے بڈل کی کاپیاں سینہ سے لگا کر سو جاتے، دہلی اسٹیشن سے سیدھے مطبع جاتے شام کو مطبع کے بند ہونے کے بعد شیخ رشید احمد صاحب مرحوم کے یہاں تشریف لے آتے اور دوسرے دن اتوار کی شب میں دہلی سے روانہ ہو کر ایک بجے سہارنپور پہونچ جاتے یہ ان ڈیڑھ تین سال کا مستقل معمول رہا شیخ فرماتے ہیں کہ "اتوار کو پریس کی چھٹی ہوتی تھی لیکن ہندوستانی پریس کے مالک جو ایک شریف اور خلیق ہندو تھے اس ناکارہ کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مدارات کرتے وہ کبھی کبھی میرے کام کی اہمیت کی وجہ سے ایک دو شفٹوں کی چھٹی موقوف کر دیتے اور کارکنوں کو اوور ٹائم (OVER TIME) دیتے اس صورت میں بجائے اتوار کی شب کے پیر منگل کو واپسی ہوتی، شمائل ترمذی کا ترجمہ خصائل نبوی انھیں ایام میں صرف دہلی کے قیام میں لکھا گیا جب دہلی جاتا تو حاجی محمد عثمان صاحب مرحوم کی دکان سے جو پریس کے بالکل قریب تھی یہ اوراق اٹھا لیتا، اور پروفوں کی تصحیح سے جو وقت بچتا اس میں ایک آدھ صفحہ کا ترجمہ لکھ لیتا، اور جب واپس آتا تو ان اوراق کو انھیں کی دکان پر رکھ کر چلا آتا گویا یہ تالیف صرف ایام سفر کی ہے البتہ نظر ثانی میں طباعت کے وقت کچھ اضافے ہوئے۔

عقد نکاح

مولانا محمد یحییٰ صاحب کے انتقال پر حضرت شیخ کی والدہ صاحبہ کو بخار شروع ہو گیا تھا، اور اس نے بڑھتے بڑھتے تپ دق کی صورت اختیار کر لی انھوں نے مولانا کے انتقال کے بعد ہی سے شدت سے شیخ کی شادی کا تقاضہ کیا، اور فرمایا کہ میں جلد ہی

جانے والی ہوں، میرا دل چاہتا ہے کہ تیرا گھر کھلا ہے، شیخ کی نسبت مولانا رؤف الحسن صاحب
کی صاحبزادی بی بی امۃ المتین صاحبہ سے تھی، انھوں نے بھی اس خواہش کا اظہار حضرت سہارنپوری سے
کیا، حضرت نے کاندھلہ لکھوا دیا کہ میرا خیال ہے کہ عزیز زکریا کا نکاح جلد ہو جائے،
امتثال حکم میں ان حضرات نے لکھ دیا کہ جب چاہیں تشریف لے آئیں، چنانچہ حضرت چند
آدمیوں کو لے کر کاندھلہ تشریف لے گئے، نکاح کے بعد شیخ نے کہلوایا کہ کاندھلہ تو میرا وطن
ہے، رخصتی کرا کے لے جانے کی ضرورت نہیں، میں دو تین روز کاندھلہ ٹھہر کر چلا آؤں گا،
کاندھلہ والوں نے قدرتاً اس کو بہت پسند کیا، لیکن جب حضرت کو یہ فقرہ پہونچا تو فرمایا
کہ وہ کون ہے لے جانے والا؟ باپ بن کر تو میں آیا ہوں، لڑکی کل میرے ساتھ جائے گی،
چنانچہ دوسرے دن رخصتی ہو گئی، اور یہ حضرات سہارنپور واپس آ گئے، ۲۷ رمضان ۱۳۳۳ھ
کو والدہ ماجدہ نے انتقال کیا، حضرت سہارنپوری نے نماز جنازہ پڑھائی۔

لہ ایک صاحبزادی مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے نکاح میں تھیں، جو مولانا محمد یوسف صاحب کی
والدہ تھیں، اس طرح شیخ اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہم زلف بھی تھے، ان اہلیہ سے شیخ کی
پانچ صاحبزادیاں تولد ہوئیں (۱) ذکیہ، زوجۂ اولیٰ مولانا محمد یوسف صاحبؒ (۲) ذاکرہ، زوجۂ مولانا انعام الحسن
صاحب (۳) شاکرہ، زوجۂ مولوی محمد حسن صاحب ابن حاجی محمد حسن (۴) راشدہ، زوجۂ مولوی سعید الرحمن ابن مولانا لطیف الرحمن
(مولوی سعید الرحمن کی وفات کے بعد ان کا نکاح مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے ان کی زوجۂ اولیٰ کے انتقال کے بعد ہوا) (۵) شاہدہ زوجۂ مولوی
حکیم محمد الیاس سہارنپوری۔ ؎ حضرت شیخ کے ساتھ جو برادرانہ اور سرپرستانہ تعلق تھا اس کی
مزید تصدیق اس واقعہ سے ہوگی جو شیخ نے لکھا ہے، فرماتے ہیں کہ:

"ایک منشی نے میرے اور وقت کی حاضری پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے کہا، حضرت
یہ کہ صاحبزادہ ہیں، حضرت نے ارشاد فرمایا صاحبزادہ سے بڑھ کر" (آپ بیتی بالفاظ دیگر زبانی عربی ۵۰)

عقدِ ثانی

شیخ کی پہلی اہلیہ محترمہ کی وفات جو مولانا رؤف الحسن صاحب کی صاحبزادی تھیں ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ (۲۷ فروری ۱۹۳۷ء) میں ہوئی ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کے قلب پر اس کا طبعی اثر تھا، اور ان کی طبیعت اب بالکل یکسوئی اور علمی و تصنیفی انہماک کی طرف مائل تھی اور عقدِ ثانی کا کوئی خیال نہیں تھا[1] لیکن شفیق چچا نے جو باپ کے قائم مقام تھے شیخ کے اس تجرد کو پسند نہیں کیا، دوسرے شفیق بزرگوں اور بہی خواہوں کی یہی خواہش تھی کہ شیخ کا گھر پھر آباد ہو اس لئے چار مہینے بھی پورے نہیں گزرے تھے کہ شیخ کا عقدِ ثانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی صاحبزادی (مولانا محمد یوسف صاحب کی ہمشیرہ) سے بعد جمعہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ (۱۸ جون ۱۹۳۷ء) کو ہو گیا[2] نکاح نظام الدین دہلی میں ہوا، اس موقع پر حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری بھی تشریف لے آئے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو سہارنپور اسٹیشن پر معلوم ہوا تو پیام بھیجا کہ نکاح میں آ کر پڑھوں گا، چنانچہ دہلی تشریف لائے اور بعد نماز جمعہ نکاح پڑھایا۔[3]

پہلا حج

۱۳۳۸ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے پھر حج کا عزم فرمایا

---

[1] اپنی "آپ بیتی" میں لکھتے ہیں کہ مرحومہ کے انتقال کے بعد اپنے مشاغل علمیہ کی وجہ سے بالکل یہ طے کر چکا تھا کہ دوسرا نکاح نہیں کروں گا کہ بڑا احمق ہو گا۔ (آپ بیتی ۲ ص ...)

[2] ان اہلیہ محترمہ سے شیخ کے فرزند ارجمند مولوی محمد طلحہ سلمہ اللہ تعالیٰ اور دو صاحبزادیاں صفیہ، شاکرہ ہوئیں۔

[3] آپ بیتی ۲ ص ۱۶۲-۱۶۳

شیخ کو اب تو یہ یاد نہیں کہ ان پر حج فرض تھا یا نہیں، لیکن بیت اللہ کا شوق اور حضرت کی ہم رکابی کا جذبہ رفاقت کا محرک ہوا۔ یہ شیخ کا حج اسلام (پہلا حج) تھا۔ شعبان ۱۳۴۵ھ کی کسی تاریخ کو روانگی ہوئی۔ حضرت نے بمبئی میں اعلان فرما دیا کہ جس کو جس سے مناسبت ہو وہ اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔ شیخ مولوی مقبول صاحب کی اجازت و منظوری سے جو حضرت کے منتظم کار تھے، حضرت ہی کے شریک طعام اور خادم خاص ہو گئے جس کو حضرت نے بخوشی منظور کر لیا۔ شیخ نے مصارف کے لئے اپنی پوری رقم بلا حساب کتاب مولوی مقبول صاحب کے حوالہ کر دی۔ جہاز ہی میں رمضان شروع ہو گیا۔ تراویح کا انتظام ہوا، حضرت اور شیخ دونوں قرآن شریف سناتے تھے۔ مکہ معظمہ حاضری ہوئی تو مولانا محب الدین صاحب[1] نے جلد ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ یہاں تو ایک قیامت آنے والی ہے[2]۔

رمضان مبارک میں شیخ کا معمول تھا کہ تراویح سے فراغت کے بعد روزانہ احرام کی چادریں لے کر پیدل اپنے چند ہم عمر نوجوان ساتھیوں کے ساتھ تنعیم جاتے اور عمرہ لاتے۔ ساری رات اسی مبارک معمول میں گزر گئی۔ اس زمانہ میں حجاز میں سخت بدامنی تھی، قافلے لٹتے تھے اور حجاج سخت خطرات اور مصائب سے گزر کر مدینہ طیبہ پہنچتے تھے۔ شوال کا مہینہ شروع ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ میں تو مدینہ طیبہ کئی بار حاضری دے چکا ہوں، معلوم نہیں تم لوگ پھر حاضر ہو سکو یا نہیں، اس لئے مدینہ طیبہ کی زیارت کر آؤ۔ شیخ کو یہ کہہ کر کہ الائمۃ من قریش، قافلہ کا امیر بنا دیا، خدا کے فضل و کرم سے راستہ

---

[1] آپ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلیفہ اور بڑے صاحب کشف و ادراک بزرگ تھے۔

[2] شریف حسین کی بغاوت اور نجدیوں کے حملہ کی طرف اشارہ ہے۔

بڑے امن و اطمینان کے ساتھ طے ہوا، رفقائے سفر اور عرب جمال، شیخ سے بہت مانوس اور بے تکلف ہوگئے اور انھوں نے بڑی خدمت کی، مدینہ طیبہ میں صرف تین دن کا قیام کا ارادہ تھا لیکن بعض غیبی اسباب کی بنا پر ایک ماہ کا قیام رہا، اس زمانہ میں مدت مقررہ سے زائد رہنے پر فی یوم ایک گنی ادا کرنی پڑتی تھی لیکن یہ مدت قیام نہ صرف مفت، بلکہ امیر مدینہ کی معذرت کے ساتھ پوری ہوئی، اس سفر میں اور بھی غیبی مددیں اور عنایات خاص رہیں جن کے واقعات شیخ بڑے لطف اور کیفیت سے بیان فرماتے تھے۔

شیخ کے منشا کی تکمیل میں سعی و جانفشانی

اسی سفر (۳۸-۱۳۳۹ھ) میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے علی جان والوں کے یہاں مصنف عبدالرزاق کا قلمی نسخہ دیکھا، حضرت نے مدرسہ مظاہر العلوم کے لئے اس کے خریدنے کی خواہش ظاہر فرمائی، انھوں نے متوحش گنی اس کی قیمت بتلائی، قیمت بہت زیادہ تھی، حضرت نے اس کے خریدنے کا ارادہ ترک فرما دیا، شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس کی اجازت مل جائے تو شاید ہم لوگ اس کو نقل کر لیں، حضرت نے فرمایا واپسی کے چند دن باقی ہیں اتنے میں کیسے نقل ہو گی؟ میں نے عرض کیا کہ ان شاء اللہ ضرور ہو جائے گی آپ اجازت لے لیں، حضرت نے ان سے نقل کی اجازت مانگی، انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے، دس بارہ دن واپسی کے رہ گئے ہیں کیوں انکار کریں، یہ کہہ دیا کہ بڑے شوق سے نقل کرائیں، شیخ نے قیام گاہ پر لا کر اس کی جلد توڑ دی، اس کا زیادہ حصہ اپنے ذمہ اور بقیہ رفقاء کے ذمہ تقسیم کر دیا، جو اس سفر میں ساتھ تھے، صبح سے لے کر ظہر تک سب اس کو نقل کرتے اور عصر سے مغرب تک شیخ اور حضرت اس کا مقابلہ کرتے

دس پندرہ دن میں نقل مکمل ہوگئی، اور واپسی سے ایک دو دن پہلے اس کی جلد بندھواکر کتاب واپس کردی گئی۔[1]

ظاہر ہے کہ شیخ کی اس عالی ہمتی، جفاکشی اور حضرت کی دلی خواہش کی تکمیل میں اپنی راحت وآرام اور دوسرے مشاغل کو قربان کرلینے سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو کیسی دلی مسرت ہوئی ہوگی، اور ان کے دل کی گہرائی سے کیسی دعائیں نکلی ہوں گی۔

محرم ۱۳۴۴ھ میں سہارنپور واپسی ہوئی۔

چند نازک امتحان اور توفیق الٰہی

شیخ کو شروع سے پے در پے ایسے نازک امتحانات پیش آئے جن میں اچھے اچھے لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، اور کوہ گراں بھی اپنی جگہ سے جنبش کرجاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے شیخ کو ثابت قدم اور راسخ العزم رکھا، ایسے امتحانات، اور توفیق الٰہی سے ان میں ثابت قدمی بعض اوقات پورے مستقبل کا فیصلہ کردیتی ہے، اس عالم اسباب میں اس کے بڑے دور رس نتائج نکلتے ہیں ایک چھوٹا سا واقعہ بعض اوقات زندگی میں حدفاصل کا کام دے دیتا ہے اور بہت سی ترقیات اور فتوحات کا مستحق بنادیتا ہے۔

(۱) مولانا محمد یحییٰ صاحب کے انتقال کے تیسرے ہی دن حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نے جن کو معلوم تھا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب پر قرض کا بڑا بار تھا اور کوئی آمدنی اور ترکہ میں وہ ایک چھوٹا سا کتب خانہ چھوڑ گئے ہیں، جس کی بکری نہ ہونے کے برابر ہے اپنی والدہ اور ہمشیرہ کی کفالت اس لڑکے (شیخ الحدیث) کے ذمہ ہے ارشاد فرمایا کہ

[1] آپ بیتی ص ۲۳۲-۲۳۳

یہ امر بہت قابل فکر ہے، تم ابھی بچے ہو تجارت کا تجربہ نہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کو تجارت کا بڑا تجربہ ہے، تم اپنا کتب خانہ لے کر میرٹھ منتقل ہو جاؤ، اور مولانا عاشق الٰہی صاحب کے زیر نگرانی[2] مکتبہ چلاؤ، ان شاء اللہ قرض بھی جلد ادا ہو جائے گا، اور متعلقین کی کفالت بھی سہولت سے ہو جائے گی۔ شیخ فرماتے ہیں کہ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی، میں نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت یہ حکم ہے تو میرے سر آنکھوں پر، اور اگر مشورہ ہے تو میری تمنا تو یہ ہے کہ حضرت سہارنپوری کی زندگی میں کسی دوسری جگہ نہ جاؤں۔[3] حضرت رائے پوریؒ نے یہ جواب سن کر فرمایا کہ بس بس آگے کچھ کہنا نہیں ہے، میری بھی یہی خواہش تھی مگر مولانا عاشق الٰہی صاحب نے فرمایا کہ میرے کہنے کا تو اثر نہ ہوگا آپ حکم فرمائیں، اس کے بعد بڑی دعائیں دیں۔[1]

(۴) شیخ کے خاندان کا تعلق مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوا) بہت قدیم اور گہرا تھا، علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید احمد خاں مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی کے شاگرد تھے، اور انھوں نے اس تلمذ کا ہمیشہ بڑا احترام کیا جس کے نتیجہ میں اس خاندان کے ذہین اور شریف نوجوان مختلف دوروں میں علی گڑھ کالج سے استفادہ کرتے رہے، ان میں بیسویں صدی کے ابتداء میں دو بھائی مولوی بدر الحسن صاحب (جو سب جج کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے) اور مولوی ظفر الحسن صاحب (جو ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے) خاص طور پر ممتاز و نامور ہوئے، شیخ کے اکثر ہم عمر، اور قریبی عزیز

۱؎ آپ بیتی ص۲۲ ۲؎ حضرت سہارنپوری اس وقت حج سے واپس آئے تھے، بذل المجہود میں تحقیقات کے سلسلہ میں مقیم تھے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حیات خلیل ص ۲۲۱-۲۲۲

۳؎ یاد رہے کہ اس وقت شیخ کی عمر بیس سال تھی۔

علی گڑھ میں تعلیم پائے تھے، مولوی بدر الحسن صاحب حضرت علی گڑھ کے اولڈ بوائے
(old boy) تھے جو کالج کے ٹرسٹی اور اس کے اہم ارکان میں سے تھے اس وقت لکھنؤ
میں سب جج تھے، شیخ کی تنخواہ صرف ۱۵ روپیہ ماہانہ تھی، آئندہ کی ترقیات کا بھی
حال معلوم تھا، والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، خاندان کا معیار زندگی، زمینداری
اور اعلیٰ سرکاری عہدوں کی وجہ سے خاصا بلند تھا، مولوی بدر الحسن صاحب نے از راہ شفقت
بہ خصوصیت یہ کہ شیخ جن کی ذہانت اور ادبیت خاندان میں مشہور اور مسلّم تھی، پرائیویٹ طور پر
علوم مشرقیہ کا اور اس کے ذریعہ یونیورسٹی کا امتحان دیدیں، اس کے بعد کالج میں تین سو روپے کی
ملازمت یقینی ہے، خاندان کے بزرگوں کی طرف سے اس بارے میں نہ صرف تائید تھی، بلکہ
اصرار تھا جو ناراضگی کی حد تک پہنچ گیا، لیکن شیخ نے ادب گزارش کے ساتھ اس سے
انکار کیا اور فرمایا کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس میں کمی و بیشی کا تعلق صرف مقدر سے
ہے، اگر قسمت کو رزق کی کشائش اور روزی کی فراخی منظور ہے تو یہیں بیٹھے بیٹھے وہ حاصل
ہوگی، ورنہ ہزار تعلیم کرنے کے بعد بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں، شیخ کا یہ جواب سن کر خاندان
کے ایک بزرگ (مولوی شمس الحسن صاحب) نے جو شیخ کو سمجھانے آئے تھے، بڑی مسرت کا
اظہار کیا اور بڑی ہمدردی کی۔[1]

(۴) اس سے بڑا امتحان چند دنوں کے بعد پیش آیا، کرنال میں نواب عظمت علی خان
مظفر جنگ کے مشہور وقف کی جائداد سے ایک بڑا تبلیغی دار العلوم قائم کیا گیا، جس کی خصوصی
غرض و غایت یہ تھی کہ اسلام کی تبلیغ اور اس کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے، نیز
جدید شبہات اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے جو اس وقت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی ۲ ص ۸۱ تا ۸۹

اپنی تعلیمی کوششوں میں بہت سرگرم تھے ایسے فضلاء تیار کئے جائیں جو عربی و انگریزی دونوں سے واقف اور علوم قدیم و جدید دونوں کے جامع ہوں، اس کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ بڑے وظائف دے کر مستند عربی مدارس کے فضلاء کو انگریزی اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغین کو عربی پڑھائی جائے، مولانا سر رحیم بخش صاحب مرحوم، جو ریاست بہاولپور کے صدر کونسل اور ریجنٹ تھے، اس تحریک کے بڑے سرپرستوں میں تھے، ان کا تعلق گنگوہ، رائے پور اور سہارنپور سے خاندانی اور مخلصانہ تھا، اور وہ مظاہر علوم کے بھی سرپرستوں میں تھے، انھوں نے ابتدائی درس حدیث کے لئے شیخ کا انتخاب کیا، اور اس کے لئے بہاولپور کا مستقل عزم کیا، ضابطہ کی تین سو ماہانہ تنخواہ کے علاوہ انھوں نے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کا وعدہ فرمایا، مثلاً رمضان کی چھٹی حضرت کی خدمت میں رہنے کے لئے ہر سال تین ماہ کی چھٹی بلا وضع تنخواہ، اجناس کی سہولت، ان سب کے ساتھ ان کی صرف ایک شرط یہ تھی کہ حضرت پر ظاہر نہ ہو کہ یہ تحریک ان کی ہے، اس لئے کہ مظاہر العلوم کے ایک سرپرست کی حیثیت سے ان کے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ مدرسہ کے مدرس کو کسی اور جگہ کے لئے آمادہ کریں، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دو سال کی چھٹی لے لو، اور یہ بھی کہ قرض کا بار زیادہ ہے، شادی بھی ہو چکی ہے اور بچے بھی ہیں، مدرسہ کی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔

اس وقت شیخ کی تنخواہ تیس روپئے تک پہونچی تھی، مولانا سر رحیم بخش صاحب کے دیرینہ تعلقات ان کی بزرگانہ و مخدومانہ حیثیت ان کا پرخلوص اصرار، قرض کا بار تنخواہ کی قلت اور ترقی کے امکانات کا فقدان یہ سب وہ "حقائق" تھے جو اس پیشکش کو

---

۱ مدرسہ کو ان کی ملازمت کی پیش کش کا قصہ ۱۳۳۲ھ اور ۱۳۳۳ھ کے درمیان کا ہے۔

قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے، اور ان کے لیے شرعی، اخلاقی، علمی دلائل بھی پیش کرتے تھے، یہ ایک نوجوان عالم کے لیے جو ذہانت کے جوہر سے آراستہ، اور حدیث و ادب میں شہرت یافتہ تھا، ایک بڑی آزمائش تھی، شیخ اس وقت حقیقتاً ایک دوراہے پر کھڑے تھے، اگر وہ اثبات میں فیصلہ کرتے تو ان کی زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا، اور آج شاید ان سطور کے لکھنے کی نوبت نہ آتی کہ عرصہ ہوا کہ وہ اسکیم فیل ہو چکی، مدرسہ کا نام و نشان باقی نہیں رہا، اس کے لائق مدرسین کچھ تو پیوند خاک ہو گئے، اور کچھ گمنامی کی زندگی گذار رہے ہیں، بظاہر اسباب شیخ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا۔

لیکن توفیق الٰہی نے دست گیری فرمائی، اور جس کو شیخ الحدیث کے لقب سے مقبول خاص و عام ہونا تھا، اور جس سے قدرت کو حدیث کی خدمت، طلبائے علوم دینیہ کی تربیت، اور ایک عالمگیر دینی تحریک (تبلیغ) کی سرپرستی، اور مشائخ عصر کی جانشینی کا اہم کام لینا تھا، اس کو اس معاملہ میں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی گئی، شیخ کے الفاظ ہی میں سنیے، فرماتے ہیں:۔

"اس ناکارہ نے مولانا مرحوم سے کہا کہ آپ کے مجھ پر احسانات بہت زیادہ ہیں، ان احسانات کے مقابلہ میں مجھے آپ سے معذرت کرنی نہایت ہی نامناسب ہے، لیکن اس سب کے باوجود آپ تو مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت سے اجازت لوں، لیکن آپ کے براہ راست کہنے پر، اگر حضرت مجھے حکم بھی فرمائیں گے تو میں عرض کر دوں گا کہ اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں۔"

عزیمت کا یہ جواب سن کر مولانا رحیم بخش صاحب جو بڑے جوہر شناس، اور جہاں دیدہ تھے، کبیدہ خاطر نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے جواب کی بڑی قدر کی،

اور فرمایا کہ میں تمہارا معتقد تو پہلے سے تھا لیکن اس جواب سے میں اور زیادہ معتقد ہو گیا

(۴) سنہ ۴۲ھ میں جب دورہ کے اسباق شیخ کے زیر درس تھے اور خاص طور پر ابوداؤد کئی سال سے بڑی قابلیت سے پڑھا رہے تھے ان کے ایک شاگرد مولوی عادل ندوی گنگوہی کا جو دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن میں تصحیح کے کام پر ملازم تھے ایک طویل خط آیا جس میں لکھا تھا کہ دائرہ میں بیہقی کے رسالہ رجال پر مستقل تالیف کا فیصلہ ہوا ہے یہاں کی مجلس نظما اس کام کے لئے دو ناموں پر متفق ہوئی ہے ایک مولانا انور شاہ صاحب پر ایک آپ پر کام چونکہ بڑی مشقت اور غور طلب ہے اس کے لئے جفاکش و جوان عمر آدمی کی ضرورت ہے اس لئے دائرہ کا رجحان آپ کی طرف ہے تنخواہ آٹھ سو روپے ماہوار ہوگی، سرکاری موٹر بھی ملے گی اور مکان بھی دیا جائے گا ملازمت صرف چار گھنٹے کی ہوگی، باقی آپ آزاد رہیں گے کتب خانہ آصفیہ سے استفادہ کی بھی آزادی رہے گی اور یہ کہ شیخ اس وقت اوجز المسالک کی تالیف میں مشغول تھے جس کے لئے وسیع کتب خانہ کی ضرورت تھی، اس پیشکش میں متعدد اقتصادی، اخلاقی و علمی ترغیبات تھیں، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ بڑے قوی دلائل اور وجوہ جواز تھے لیکن شیخ نے اس کو قابل غور اور لائق مشورہ بھی نہیں سمجھا اور اس کے جواب میں برجستہ ایک کارڈ لکھ دیا جس میں صرف یہ مصرعہ تھا۔ ع

مجھ کو جینا نہیں بندۂ احسان ہو کر

نیچے دستخط تھے[1]

(۵) اس سے بڑا امتحان یہ پیش آیا کہ جب ڈھاکہ کے مدرسہ عالیہ سے[2]

۱؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی" ... گے شیخ نے جو اس زمانہ میں بار بار اس کا اظہار کیا

واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا، رفقائے خاص کو اس کا علم تھا، اور کہتے تھے کہ آپ تو یہاں بقیع میں آسودۂ خاک ہونے کے لئے آئے ہیں، مدرسے کے شیرازہ کو مجتمع رکھنے اور اس دورِ پرفتن کے آفات و شرور سے اس کو الگ رکھنے کے لئے نیز ارشاد و تربیت کے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے جو حضرت کی ذات سے وابستہ تھا، شیخ کی واپسی ہندوستان ہی کو مناسب تھی، مولانا سید احمد صاحب[1] مدنی نے اپنے مدرسۂ شرعیہ کے لئے شیخ کو روکنے کی بڑی کوشش فرمائی، ان کا اصرار تھا کہ واپس نہ جائیں، وہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کرایہ کی رقم بھیج دیں گے تاکہ وہ شیخ کے متعلقین کو مدینہ طیبہ پہونچا دیں، لیکن حضرت سہارنپوری نے مظاہر العلوم کی اہمیت کے پیش نظر اس کو قبول نہیں فرمایا، بلکہ شیخ کے لئے "شیخ الحدیث" کے عہدہ اور "نائب ناظم" کے منصب کی تحریر لکھ کر دے دی، جس پر شیخ نے بڑی عرض و معروض کی، آخر میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کو بیچ میں ڈالا، مولانا نے ایک لطیف عنوان سے خدمت میں عرض کر کے "نائب ناظم" کی ذمہ داری سے ان سبکدوش کرا دیا، "شیخ الحدیث" کے منصب کے لئے حضرت نے اپنے دست مبارک سے تحریر لکھ کر کتاب میں رکھدی، اور ایسا انتظام فرمایا کہ شیخ کی نظر اس پر پڑ جائے۔

رخصت کرنے سے پہلے چاروں سلسلوں میں بیعت و ارشاد کی عام اجازت عطا فرمائی اور اس کے لئے بڑا اہتمام فرمایا، اپنے سر سے عمامہ اتار کر مولانا سید احمد صاحب کو دیا کہ شیخ کے سر پر باندھیں، جس وقت وہ عمامہ شیخ کے سر پر رکھا گیا، شیخ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ چیخیں نکل گئیں، حضرت بھی آبدیدہ ہو گئے، شیخ نے بعض مجلسوں میں فرمایا کہ

---

[1] برادر اکبر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ و بانی مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ۔

عمامہ رکھتے ہی مجھے اپنے اندر کوئی چیز آتی محسوس ہوئی، اس سے میں سمجھا انتقالِ نسبت کی شاید یہی حقیقت ہے۔ شیخ نے اس اجازت کو بہت پوشیدہ رکھا اور شاید عرصہ تک ہندوستان میں اہلِ تعلق کو اس کا علم نہ ہوتا، لیکن حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشہیر کردی، پھر بھی عرصہ تک بیعت لینے سے انکار کرتے رہے، لیکن عم محترم مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے اس کا سلسلہ شروع کیا، سب سے پہلے خاندان کی چند بہنوں نے بیعت کی درخواست کی، شیخ نے حسبِ عادت انکار و معذرت کی، انھوں نے مولانا محمد الیاس صاحب سے عرض کیا، مولانا نے شیخ کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ بیعت کریں، شفقتاً اپنا عمامہ بھی سر پہ رکھ دیا، رفتہ رفتہ اہلِ صلاح و علم کا رجوع ہوا اور وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

بابِ چہارم

سہارنپور کا مستقل قیام، تدریس و تصنیف، ارشاد و تربیت، حج کے اسفار اور چند اہم واقعات

حجاز سے واپسی اور سہارنپور کے مشاغل

حجاز سے واپسی پر آپ ہمہ تن تدریس و تصنیف میں مشغول ہوگئے، واپسی کے بعد سے ابوداؤد کا درس بھی آپ ہی کے پاس آگیا، "بذل" کی ترتیب میں شریک رہنے اور حضرت سہارنپوریؒ کی خصوصی توجہ کی وجہ سے اس کی تدریس میں قدرتی طور پر آپ کو امتیاز حاصل تھا، "اوجز" کی تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا، حضرت گنگوہیؒ اور والد ماجد کی تحقیقات و تقریرات کی اشاعت کا بھی شغل رہتا تھا، اس کے علاوہ دوسرے دینی و تبلیغی رسائل جو زیادہ تر بزرگوں دوستوں بالخصوص عم بزرگوار حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ارشاد و تاکید سے لکھے گئے، تحریر میں آتے رہے۔

ان تدریسی و تصنیفی مشاغل کے علاوہ مدرسہ کے انتظام میں آپ شریک غالب اور مولانا حافظ عبد اللطیف صاحبؒ[1] کے قوت بازو اور دست راست تھے، بحث طلب مسائل و امور میں اکثر آپ ہی کی رائے فیصلہ کن اور قطعی ہوا کرتی تھی، جس پر مشائخ عصر اور اکابر سلسلہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ

[1] مولانا عبد اللطیف صاحب، ناظم مظاہر العلوم نے [illegible] ذوالحجہ [illegible] کو وفات پائی۔

کاندھلوی، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، حضرت حافظ فخرالدین صاحب پانی پتی اور شاہ محمد حسین صاحب گنگوہی سب کی بکثرت آمد و رفت رہتی تھی، اور آپ سب کے منظورِ نظر محبوب مشیر اور محرم راز تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو فطری جامعیت، اعتدال و توازن، بڑے چھوٹے اور ہر مزاج کے آدمی کے ساتھ نباہ کر لینے اور باہمی ربط و تعلق کا ذریعہ بننے کی صفت عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے آپ کی ذات اور آپ کا مستقر سب کا مرکز اور سب کے لئے نقطۂ اجتماع تھا، اور کلیات سے لے کر جزئیات تک آپ اکثر مشیر و دخیل رہتے۔

اس سب کے ماسوا مہمانوں کا ہجوم جو اس مقبولیت کا قدرتی نتیجہ تھا، وارد ین اور صادرین کی کثرت، اور دسترخوان کی وسعت بڑھتی چلی گئی، اور اس نے آپ کی مشغولیت میں روزافزوں اضافہ کر دیا، یہاں تک کہ وہ آپ کا ایک ایسا امتیاز بن گیا، اور اس نے ایک ایسی شہرت حاصل کر لی، جو بہت سے لوگوں کے لئے موجبِ حیرت ہے۔ مولانا عبداللطیف صاحب کی وفات کے بعد جو ایک کہن سال، جہاں دیدہ، تجربہ کار شخص اور مستعد ناظم تھے، مدرسہ کے انتظام و انصرام، اور اس کی بقا و قیام کا سب سے بڑا بوجھ آپ پر پڑ گیا، اگرچہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سابق صدر مدرس اپنے علم و فضل، اور اخلاص و للہیت کی بنا پر مدرسہ کے قدیم شیوخ و اکابر اور سرداروں کے صحیح جانشین تھے، اور ان کا وجود مدرسہ کے لئے ایک بڑی نعمت تھی،[۱] لیکن ان کے گوناگوں امراض، بڑھتی ہوئی معذوری اور ضعف کی بنا پر شیخ کو مدرسہ کے نظم و نسق اور جزئیات و کلیات کے لئے خاص وقت دینا پڑتا، اور ان کی ذات ان کی قوتِ فیصلہ اور ان کا شخصی اثر ہی مدرسہ کا پشت پناہ تھا۔

ادھر خدا کا ان کے ساتھ خاص معاملہ یہ تھا کہ جو شیخ و مربی دنیا سے جاتا وہ اپنے مسترشدین و متعلقین کو یا تو خود شیخ کے سپرد کر جاتا یا وہ خود کسی اشارۂ غیبی سے یا اس

[۱] ۵ رجب ۱۳۹۹ھ (۱۱ جون ۱۹۷۹ء) میں مولانا نے اس دارفانی سے رحلت فرمائی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

شیخ الحدیث کے منصب کی پیش کش ہوئی جس کی بارہ سو روپے تنخواہ تھی، اور صرف ترمذی اور بخاری پڑھانا تھا۔ پہلے خط آیا پھر ارجنٹ تار کہ تار کے جواب کا سخت انتظار ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ تار کے جواب میں میں نے صرف یہ لکھ دیا کہ معذوری ہے، خط میں مفصل لکھا کہ جن دوستوں نے آپ کو میرا نام دیا ہے انھوں نے محض حسن ظن سے کام لے کر غلط روایات پہونچائی ہیں یہ ناکارہ اس کا اہل نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد پھر غالباً کوئی اور ایسا امتحان پیش نہیں آیا، اور نہ اس کا کوئی موقع تھا کہ شیخ کی بلند ہمتی، ان کا طرز زندگی، خداداد قبولیت اور خدا کی مسبب الاسبابی کا عینی مشاہدہ جو ہر جانے والے اور ہر آنے والے کو کھلی آنکھوں ہوتا رہتا تھا، کسی کے اندر اس کا خیال بھی نہیں ہونے دیتا تھا کہ ایسا مشورہ دیا جائے یا کوئی ایسی پیش کش کی جائے تو عمر اور مدرسی کے آغاز ہی میں ان کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی ایسے سب لوگوں کو یہ کہہ کر مایوس کر دیتی۔ ع

بروایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اور اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ کی نصرت اور کفالت کا اونچا مشاہدہ اور تجربہ ہو گیا، اور اللہ تعالیٰ نے مدارج عالیہ سے سرفراز فرمایا، اور اپنی محبت و رضا کی دولت سے نوازا، تو اب تو زبان حال، امیر خسرو کی زبان میں اس طرح گویا ہے کہ ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

---

[1] آپ بیتی ۲ ص ۱۰۰

(۶) ان امتحانات کے علاوہ جن کا تعلق معاشیات زہد و قناعت اور فراغت و وسعت میں سے کسی ایک کے انتخاب سے تھا، ایک امتحان ابتدائے عمر میں اور بھی پیش آیا تھا، اور اس زمانہ کے حالات اور عمر کے لحاظ سے آسان امتحان نہ تھا، وہ یہ کہ مرزا ثریا جاہ کی صاحبزادی قیصر جہاں بیگم سے مولانا محمد یحییٰ صاحب کے رشتہ کو جب خود مولانا محمد اسماعیل صاحب اور مولانا محمد یحییٰ صاحب نے قبول نہیں کیا، اور ان کی شادی اپنے گھرانہ میں ہو گئی تو اس خاندان سے تعلق و عقیدت کی بناء پر ان کی تمنا ہوئی کہ وہ اپنی لڑکی کا نکاح شیخ الحدیث سے کر دیں، جن کی اس گھر میں بچوں کی طرح آمد و رفت تھی، مولانا محمد یحییٰ صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا، مگر ان کے شدید اصرار پر ایک مرتبہ امتحاناً شیخ سے دریافت کیا، شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ابا جان لئے لئے پھرنا میرے بس کا نہیں، اس لئے کہ وہ بیگمات اور قیصر جہاں مرحومہ کے شوہر مرزا شاہ مرحوم کا ان سے یہ والہانہ اور نیازمندانہ معاملہ دیکھتے تھے[1]، اس طرح وہ آزمائش سے بچ گئے جو بہت سے غریب یا متوسط الحال شریف گھرانوں کے نوجوانوں کو کسی رئیس خاندان کا داماد بننے سے بارہا پیش آئی ہے، اس عمر میں ایسا خوددارانہ اور بصیرانہ جواب ایک غیر معمولی مستقبل کی پیشین گوئی کرتا تھا، اور بقاؔ کے اس شعر کی تفسیر تھا ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

---

[1] آپ بیتی ۱ ص ۱۳-۴

دوسرا سفرِ حج حضرت کی رفاقت اور مدرسہ کی تنخواہ کا معاملہ

۱۳۳۳ھ میں حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے حج کا قصد فرمایا اپنی غیر موجودگی میں مدرسہ کا انتظام اس طرح کیا کہ مولانا حافظ عبداللطیف صاحب کو مدرسہ کا ناظم[1] اور شیخ کو صدر مدرس مقرر کیا، مظاہر العلوم کے صدر مدرس کی ذمہ داریوں اور روایات میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ مختلف شہروں میں ہونے والے ان تبلیغی اور دینی جلسوں میں شرکت بھی کرے جہاں سے دعوت آئے، نیز مدارس کے سالانہ اجتماعات وغیرہ میں بھی شریک ہو، شیخ کو سفر سے فطرتاً ہی سے وحشت اور عدم مناسبت تھی، یہ معلوم کر کے کہ حضرت نے صدر مدرسی کے لئے ان کو نامزد فرمایا ہے اس عہدہ کی جلالت شان اور اس کی ذمہ داریوں کے خیال سے شیخ کو فکر پیدا ہوئی، انھوں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت بذل کے کام کا کیا ہوگا؟ اس کا سلسلہ تو سفر میں منقطع ہو جائے گا، فرمایا ہاں! مجھے بھی اس کا خیال ہے عرض کیا کہ میں ساتھ چل سکتا ہوں اس خدمت کو انجام دوں گا، فرمایا مصارف سفر کا کیا انتظام ہوگا؟ عرض کیا کہ قرض لے لوں گا، فرمایا تمہاری تنخواہ بھی کٹتی تو باقی رہے عرض کیا کہ میں نے تو اجارہ فسخ کر دیا، فرمایا فسخ دونوں طرف سے ہوتا ہے تم نے تو فسخ کیا ہم نے منظور نہیں کیا، حضرت کے اس حکم پر شیخ نے ان مہینوں کی تنخواہیں وصول کیں جن کو وصول نہیں کیا تھا، جن کی مجموعی رقم ۲۰۰ یا ۲۴۴ روپے تھی، شیخ نے اس حکم کی تعمیل کی اور اس سے سفر کا آسانی انتظام ہو گیا، لیکن جہاز چھوٹ کر ایک ہزار کا [illegible]

---

[1] بعض دوسرے دینی مدارس کی طرح مظاہر العلوم کی اصطلاح میں بھی [illegible] دوران خدمت میں شیخ جو تنخواہ لیتے [illegible]

مدرسہ کو بھیج دیا کر میری واپسی تک مولوی نصیر الدین صاحب میرے کتب خانہ سے بالاقساط ادا کرتے رہیں، چنانچہ اس پر عمل ہوا، واپسی پر شیخ نے بے حساب سود اس اضافہ کے جو بعد کیا ہوا اور جس کی میزان ۲۷۰۰ (دو ہزار سات سو ستر روپیہ) ہوتی تھی، ادا کر دی۔

حج کا یہ سفر اور استاد و مرشد کی مسلسل و بہمہ وقت رفاقت ایک عالی استعداد اور سراپا محبت و اطاعت مسترشد کے لئے جس کے سفر کا اصل مقصد ہی شیخ کی خدمت و اعانت اور استفادہ تھا، کیسی روحانی اور باطنی ترقیات اور حصول کمالات کا ذریعہ بنی ہوگی اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، شیخ نے مدینہ طیبہ کے طویل قیام میں بھی حضرت کی خدمت میں حاضر رہنے، بذل کی تالیف میں مدد دینے کے علاوہ کسی مشغلہ اور دلچسپی سے سروکار نہیں رکھا، اس مصروفیت و انہماک کی وجہ سے وہ مسجد نبوی کی حاضری اور بقیع کی زیارت کے علاوہ کہیں آجا نہیں سکے۔

"بذل" کے کام کے علاوہ انھوں نے اثنائے قیام مدینہ طیبہ (کی رعایت سے) امام دار الہجرۃ امام مالکؒ کی مشہور و مقبول کتاب "مؤطا" کی شرح لکھنی شروع کر دی، جو "اوجز المسالک" کے نام سے بعد میں چھ جلدوں میں مکمل ہوئی،[1] مکہ معظمہ کے قیام میں بھی اگر حضرت نے کسی کتاب کی نقل یا کوئی علمی خدمت سپرد کر دی، تو شیخ نے اس کی تکمیل کو بھی اپنا وظیفہ اور اپنی ترقی کا ذریعہ سمجھا اور اس میں پورے انہماک سے کام لیا۔

اجازت و رخصت

حضرت سہارنپوری مدینہ طیبہ میں مستقل قیام کے ارادہ سے گئے تھے، آپ کا

---

[1] شیخ فرماتے ہیں کہ اس کی تصنیف کا کام مواجہ شریف کے قریب ہوتا تھا، اور جتنا حصہ مدینہ طیبہ کی مختصر مدت قیام میں لکھا گیا، وہ ہندوستان کے مہینوں اور برسوں کے قیام میں بھی نہ ہو سکا۔

جس پر ۵۰۔۶۰ سے کہ سو سو تک کا مجمع نہ ہو چونکہ ایک کمزوری ٹانگ کی وجہ سے
اس کی کمر کیا ناخن کا اٹھ سکتی تھیں اس لئے میرا شیشہ پر اٹھ کر دروازہ تک
آنا پڑتا تھا مجھے تو رات میں لیٹنے کی بھی نوبت نہ آئی سنا ہے کہ اس ہجوم میں جو
پاکستان میں پہلی مرتبہ کو بھی دخل ہے۔

حرمین شریفین تو جا کر معلوم ہوا تھا کہ یہ سیاہ کار محدث ہے ہر دو جگہ کے مشائخ
واساتذہ کا اجازت حدیث کا اشتہار بے حد بڑھا میں اپنی نا اہلیت کی وجہ سے حفاظت
اور عمل وصول کرتا تھک گیا، پاکستان آکر معلوم ہوا کہ یہ دو میاں پھر بھی ہے متعلقین
کے ہجوم نے اپنے نفوس رکھا کہ زیادہ اوقات چاروں طرف کے کواڑ بند کئے اندر بیٹھ
رہنا پڑا، پیر بعد عصر کے بعد لائل پور سے سرگودھا روانگی ہوئی اور جمعرات کی شام کو
عصر کے بعد سرگودھا سے ڈھڈیاں شریف روانگی ہوئی لائل پور اور سرگودھا کی گرمی اس قدر
ناقابل برداشت تھی کہ باوجود چاروں طرف برف کی سلیوں اور کئی کئی بجلی کے
پنکھوں کے اس ناکارہ کو سکون نہ ہوتا تھا۔ لائل پور میں ۲ دن اور سرگودھا میں
۲۱ اور ہے تب باعث رہا تھا ڈھڈیاں سے ہر شخص ڈراتا تھا کہ وہاں بجلی ہے نہ پنکھا وہ
دیگر میں سرگودھا کا ناتج بیا اس لئے اپنے کو بھی بہت ہی فکر تھا، مگر حضرت نور اللہ
مرقدہ کو تو ہمیشہ اس ناکارہ کی راحت کی فکر رہی اور اب بھی اس کا ظہور
ایسا ہوا کہ ڈھڈیاں کے ۶ دن حضور ہی جیسے گزرے کہ ہم سب تھے رات کو کپڑا
اوڑھنا پڑتا تھا دن کو بھی بہت دیر تک ٹھنڈی ہوائیں زوردار چلتی تھیں
کہ لطف آ جاتا تھا اوقات ایسے آخر تک گزرے ہوتے ہیں کہ وہاں کے ۶ دن
بھی بہت سے احباب کا دل بڑا کرنے تجویز ہوئے تھے اس لئے اضافہ کی

چوتھا حج

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ایک سال خالی گیا، اگلے سال ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۳ء) حجاز میں کام کرنے والوں کا تقاضا ہوا کہ حجاز، نیز بیرونی ممالک میں کام اور کام کرنے والوں کی ضرورت و مصلحت کا اقتضا ہے کہ مولانا کے جانشین اور تبلیغی دعوت کے موجودہ ذمہ دار مولانا انعام الحسن صاحب اپنے خاص رفقاء کے ساتھ اس سال حج کو آئیں، تاکہ دعوت میں نئی طاقت و استحکام اور مزید وسعت و عمومیت پیدا ہو، بڑے غور و خوض اور حالات و ضروریات کا جائزہ لینے کے بعد حضرت شیخ الحدیث کے مشورہ اور تائید سے اس کو منظور کر لیا گیا، یہ مولانا انعام الحسن صاحب کا مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے بعد اور ان کے بغیر حج کا پہلا سفر تھا جس میں ہندستان اور پاکستان کے علاوہ اسلامی و غیر اسلامی ممالک کے بکثرت رفقاء، احباب و کارکن اور علماء و خواص کا اجتماع متوقع تھا، قدرتاً مولانا انعام الحسن صاحب کی طبیعت پر اس سفر کی اہمیت اور اپنی تنہائی کا احساس غالب تھا، اور ان کا قلبی و طبعی تقاضا تھا کہ حضرت شیخ الحدیث کی معیت ان کے لئے اس عظیم سفر میں تقویت و طمانیت کا موجب ہو، دوسری طرف حجاز کے اہل تعلق اور جماعت کے رفقاء اور کارکنوں کے پیہم خطوط، اور متواتر تقاضے آ رہے تھے کہ شیخ اس سفر میں ضرور ساتھ ہوں، حجاز اور پاکستان کے اہل تعلق کو صرف اسی سفر کے بہانے اور اسی سفر کی تقریب سے زیارت و صحبت کا موقع مل سکتا تھا۔

شروع میں جماعت کے نظم و نسق کی نگرانی اور مولانا انعام الحسن صاحب کے باہر چلے جانے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوتا تھا، اس کے پیش نظر شیخ الحدیث کا نہ جانا سہارنپور میں طے کر دیا گیا، اور اس کی اطلاع بھی دے دی گئی لیکن جوں جوں مولانا انعام الحسن صاحب کی روانگی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی سارے ہندوستان میں شیخ کے جانے کی خبر بھی گرم ہوتی جا رہی تھی اور استفساری خطوط کا تانتا بندھ رہا تھا اور مقررہ تاریخ پر دہلی اور بمبئی زائرین اور رخصت کرنے والوں کے پہونچنے کی اطلاعیں آ رہی تھیں، بالآخر ۱۵ فروری ۱۹۶۰ء کو شیخ دہلی تشریف لے آئے اور ابھی تک روانگی طے نہ تھی، کسی وقت جانے کی خبر گرم ہو جاتی تھی کسی وقت نہ جانے کی، راقم السطور مولانا محمد منظور صاحب، اور مولوی معین اللہ صاحب ندوی رخصت کرنے کی نیت سے ۲۰ فروری کو دہلی پہونچے شیخ نے فوراً یاد فرمایا اور خلیہ کا حکم دیا، اس وقت صرف مولانا انعام الحسن صاحب مولانا منظور صاحب اور یہ ناچیز تھا، شیخ نے اپنی ذہنی کشمکش اور تردد کا اظہار فرمایا، اور بعض غیبی اشارات و مبشرات، دوستوں کے انتظار و اشتیاق سفر کے محرکات اس کے مقابلہ میں قیام کے اسباب و موجبات کا ذکر فرماتے ہوئے رائے طلب کی ہم لوگوں نے قیام کا رجحان ظاہر کیا، اور اس کے مصالح عرض کئے، شام تک کوئی ایک پہلو غالب اور قطعی نہیں معلوم ہوتا تھا، رات کو جب سعودی سفیر محمد الحمد الشبیلی ملنے کے لئے تشریف لائے اور اس موقعہ پر مجلس خاص میں حاضری ہوئی تو جانے کا فیصلہ معلوم ہوتا تھا، چنانچہ یہ اندازہ ہو گیا کہ سفر طے ہو گیا ہے۔

ملاقات اور رخصت کرنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، نظام الدین میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے اور شیخ تک پہونچنے میں ہزار دقتیں معلوم ہوتی تھیں،

یگانگت واعتماد کی بناء پر جو ان کے شیخ و مربی روحانی کو شیخ پر تھا، وہ سب شیخ کی ذات ہی کی
طرف رجوع کرنے اور بالعموم شیخ سے اپنی تکمیل و تربیت اور مشورہ و رہبری کا کام متعلق کر دیتے
مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا معاملہ تو گھر ہی کا تھا، لیکن ان سے پہلے مولانا عاشق الٰہی صاحب
میرٹھی اور ان کے بعد مولانا مدنی، پھر حضرت رائے پوری، اور سب کے آخر میں مولانا محمد یوسف
صاحب کی وفات کے بعد ان سب حضرات کے اکثر اہل ارادت اور اہل تعلق نے شیخ ہی کو
اپنا روحانی سرپرست، مشیر و رہنما، اور اپنے مشائخ کا جانشین اور وارث و امین سمجھا، پھر
خصوصیت کے ساتھ مولانا محمد یوسف صاحب کی رحلت کے بعد تبلیغی حلقہ کا جس نے
اب عالمگیر تشکیل اختیار کر لی ہے، اور ہندوستان سے متجاوز ہو کر ایک طرف مراکش اور
دوسری طرف انڈونیشیا تک، اور یورپ و امریکہ تک پھیل گیا ہے، آپ ہی مرجع اور مرکز بن گئے
اس سلسلہ کو باقی رکھنے، اس کو زمانہ کے خطرات اور اس دور کے فتنوں سے بچانے، اس کے
مسلک و اصول کی حفاظت، اس کے سرگرم کارکنوں کی دینی نگرانی، روحانی تربیت و تکمیل
کی ساری ذمہ داری، اور نظام الدین کے مرکز، اور اس کے ذمہ داروں کی سرپرستی کا پورا
بوجھ آپ ہی کے کاندھوں پر پڑ گیا، اسی کے ساتھ جتنا جتنا یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا، کام کی
مقبولیت بڑھتی گئی، مشائخ کبار اٹھتے جاتے، آپ کی مرجعیت و مرکزیت اور ذمہ داریوں
میں اضافہ ہوتا رہتا، اور ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے آنے والی جماعتیں اور وفود کی
آمد و رفت بھی بڑھتی رہتی، اور اسی کے مطابق آپ کی مشغولیت اور ضیافت و تواضع کا
دامن بھی وسیع ہوتا چلا جاتا، یہاں تک کہ اگر کوئی ناواقف یا نو وارد ان مہمانوں کی
کثرت، اور دسترخوان کی وسعت دیکھتا تو وہ یہ سمجھتا کہ آج کوئی نئی بات ہے، اور کوئی
عظیم تقریب یا غیر معمولی مہمانداری ہے، حالانکہ یہ روزمرہ کا واقعہ تھا، اور اس میں کوئی بات

کوئی خصوصیت نہیں تھی۔

تیسرا حج

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا شیخ کو سفر سے طبعی عدم مناسبت بلکہ ایک طرح کی وحشت تھی، ان کے لیے دہلی جانا تو بڑی چیز ہے رائے پور اور دیوبند تک جانا بھی مجاہدہ عظیم تھا، بارہا ایسا ہوا ہے کہ سفر کے ارادہ سے ان کو حقیقتاً بخار آ گیا اور واپسی پر تو اکثر کئی کئی دن تک صحت اور اعصاب پر اثر رہا، ایسی حالت میں حج کا سفر خواہ کتنی ہی سہولت و اہتمام کے ساتھ ہو ان کے لیے ایک بڑا امتحان اور ایک شدید مجاہدہ تھا، ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ۱۳۶۸ھ کا حج آخری حج ثابت ہوگا، لیکن دفعتاً غیب سے ایک سامان پیدا ہوا، حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ (جن کی ہستی اب ان کے لیے عزیز ترین ہستی تھی اور جن کا ایما و خواہش ان کے لیے سب سے زیادہ قابل لحاظ اور قابل رعایت تھی) نے ۱۳۸۳ھ (۱۹۶۴ء) میں رفقاء اور خدام کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ حج کا عزم فرمایا، اور شیخ سے محبت و رفاقت کی درخواست کی، یہ درخواست ایسے جزم و اصرار اور ایسی محبت و خلوص سے تھی کہ شیخ کے لیے معذرت و انکار ممکن نہیں رہا، قابل فخر اور سرمایۂ ناز بھائی کا پُرمحبت اصرار، دیار حبیب کی حاضری، حج و زیارت کی سعادت، جس کے شوق کی آتش کی چنگاریاں ہمیشہ سینے میں دبی اور سلگتی رہیں، بقول شاعر ؎

اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

آپ نے رفاقت منظور کر لی، اور بجلی کی طرح یہ خبر سارے ہندوستان اور پاکستان میں پھیل گئی کہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے ساتھ شیخ بھی حج کو جا رہے ہیں، حضرت شیخ حرم کے

پروانوں کا ہجوم ہوا، اور شیخ سے جو لوگ ارادت اور عقیدت کا تعلق اور تبلیغی جماعت سے
محبت و رفاقت کا رشتہ رکھتے تھے ان کی بڑی تعداد اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے
کے لئے تیار ہو گئی، یہ ایک تاریخی سفر تھا جس کی تفصیل آپ بیتی نمبر ۳ میں دیکھی جا سکتی ہے[1]
اس سفر میں حضرت شیخ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے ساتھ طائف بھی گئے، ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ کو
سہارنپور سے روانگی ہوئی، پانچ ماہ کے عرصہ میں پاکستان ہوتے ہوئے وسط ربیع الاول میں
سہارنپور واپسی ہوئی، واپسی کے سفر میں کراچی، لاہور، سرگودھا، اور ڈھڈیاں ایک ایک
دو دو دن ٹھہرنا ہوا، پاکستان کے مجبور و محروم عقیدت مندوں نے جو سالہا سال زیارت کو
ترس رہے تھے اس موقع کو نعمت خداداد تصور کیا، شیخ کا مستقل سفر پاکستان کا نہایت
دشوار اور بعید از قیاس تھا، سفر حج کی برکت سے ان دور افتادہ خدام و محبین کی قسمت
جاگ گئی، انھوں نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا، ایک طرف مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی کشش
دوسری طرف اس نعمت غیر مترقبہ سے فائدہ اٹھانے کا شوق سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کو
درمیانی اسٹیشنوں پر کھینچ کھینچ کر لاتا، ایرکنڈیشنڈ گاڑی میں ہونے کے باوجود ساری رات
جاگ کر سراپا اشتیاق محبین کو مصافحہ و ملاقات کا موقع دیتے اور گرمی و لو کی پروا نہ کرتے۔

شیخ کو ڈھڈیاں جاکر حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور کچھ
وقت وہاں گزارنے کا بڑا شوق تھا، اور جیسا کہ بعض خاص مجلسوں میں فرمایا کہ پاکستان کا
سفر ہی خاص اسی شوق میں کیا گیا تھا، سرگودھا پہونچے تو سخت گرمی تھی، دونوں طرف
برف کی سلیں رکھی جاتیں، اور پنکھا چلتا رہتا، خدام نے ڈھڈیاں کا پروگرام ملتوی کرنے کی
بار بار درخواست کی کہ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، نہ وہاں بجلی ہے نہ برف کا انتظام ہو سکتا

---

[1] آپ بیتی نمبر ۳ ص ۲۵۸-۲۶۸

لیکن شیخ نے کسی طرح اس کو منظور نہیں کیا خدا کی قدرت کہ وہاں پہونچتے ہی موسم ایسا تبدیل ہوا کہ کسی چیز کی ضرورت پیش نہ آئی بلکہ رات کو کپڑا اوڑھنے کی ضرورت پڑ گئی۔ جب تک قیام رہا ایسا ہی خنک و خوشگوار موسم رہا، فرماتے تھے کہ حضرت کو زندگی میں پورا قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا لیکن اس کی نوبت نہ آئی، میں نے وہاں قبر مبارک کے پاس پورا قرآن مجید ختم کرنے کا اہتمام کیا، حسن اتفاق سے اس سفر کے سلسلہ میں شیخ کا ایک خط خاکسار راقم کے نام مرتب خطوط میں محفوظ ہے، اس سے اس سفر کی مزید تفصیلات اور شیخ کے تاثرات اور جذبات کا علم ہوتا ہے، وہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

ع ایں کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب

مکرم و محترم مولانا الحاج ابو الحسن علی میاں صاحب زید مجدکم

بعد سلام مسنون کراچی پہنچ کر ایک مختصر کارڈ ۲۳ رجب کو ارسال خدمت کر چکا ہوں، غالباً پہنچ گیا ہوگا، آج کی ڈاک سے مکہ مکرمہ سے ایک پیکٹ وصول ہوا جس میں مولانا سلیم صاحب نے میرے اور مولانا یوسف صاحب کے نام کے خطوط جو بمبئی بھیجے تھے یہاں بھیجے، ان میں جناب کا لفافہ مورخہ ۲ محرم الحرام الملاقات اشتیاق آمیز شفقتوں سے لبریز پہنچا، اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنے فضل و کرم سے آپ کے ان حسن ظن اور محبتوں کو طرفین کے لئے دینی ترقیات کا ذریعہ بنائے۔

تین دن کراچی ٹھہرنے کے بعد دو شنبہ کو دوپہر کی ریل سے منگل کی صبح کو ۹ بجے لائل پور پہنچے، لوگوں نے راحت رسانی میں انتہا کر دی ہے، فرسٹ کلاس ایر کنڈیشنڈ ریزرو کرا لیا تھا لیکن وہ تو مجھے اور مولانا یوسف صاحب کو راس نہ آیا اس لئے کہ کراچی سے لائل پور تک کوئی بھی چھوٹا بڑا اسٹیشن ایسا نہیں گزرا

اوپر نیچے سب بھرا ہوا تھا، عشاء کے وقت سے کھانا کھلانے کا جو سلسلہ شروع ہوا تو آخری قسط نے فجر کے وقت کھانا کھایا، تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی، صبح نماز فجر کے بعد ہوائی اڈے کے لئے رخصت ہوئے بعض اسباب و قرائن کی بنا پر بہت سے خواص کو اندیشہ تھا کہ اب واپسی نہیں ہوگی ہوائی اڈے پر بھی ایک بڑا مجمع رخصت کرنے کے لئے پہونچ گیا بعض خدام نے ہندوستان کی خصوصیات اور مسلمانوں کے مخصوص حالات کی بنا پر واپسی کی مخلصانہ درخواست اور اس کی تمنا کا اظہار کیا، نو بجے کے قریب وہاں سے بمبئی کے لئے پرواز ہوئی ۱۳ ۔ ۲۰ م بمبئی قیام رہا، اس مرتبہ مدرسہ رحمانیہ واقع ذخیرہ میں قیام تھا، ۲۳ ر کو براہ راست بمبئی سے جدہ کو پرواز ہوئی اور اسی روز صبح الخیر وہاں پہونچ گئے، سفیر ہند جناب رحمت کامل قدوائی صاحب نے جدہ کے ہوائی اڈہ پر استقبال کیا، اور اپنے ہی ساتھ اپنے مکان پر لے گئے، وہیں کھانا کھایا، وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد مولوی محمد شمیم صاحب وغیرہ کی معیت میں مکۂ معظمہ حاضری دی، مکۂ معظمہ میں قیام حسب سابق مدرسہ صولتیہ میں تھا، وہاں کا نظام الاوقات ایک اہم مکتوب سے نقل کیا جاتا ہے :-

"اس سے پہلے سفر میں صحت بھی بہ نسبت پہلے کے اچھی تھی اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے موٹریں بھی ہر وقت کئی کئی موجود رہتی تھیں اس لئے سابقہ سفر میں صبح کی نماز حرم شریف میں ہوتی تھی اور اگر کسی دن تاخیر ہو جاتی تو نماز مدرسہ کی مسجد میں پڑھ کر مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ فوراً حرم جاتے اس لئے کہ نماز کے بعد ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر مولانا یوسف صاحبؒ کی ہی ہوتی تھی شیخ الحدیث بھی ساتھ تشریف لے جاتے تھے اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بھی سنتے تھے اس کے بعد قیام گاہ پر مولانا محمد یوسف صاحبؒ

کے ساتھ چائے کا وسیع دسترخوان لگتا تھا جس میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا تھا اور جملہ حاضرین پر چائے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شدید گرفت بھی رہتی تھی۔

اس سال صبح کی تقریر تقریباً ڈھائی گھنٹے مولانا محمد عمر صاحب یا مولانا سعید خاں صاحب کی ہوتی۔ حضرت شیخ الحدیث اپنے امراض اور ضعف اور سواری کی عدم فراوانی کی وجہ سے مدرسہ کی مسجد میں نماز ادا فرماتے ہیں اس کے بعد فجر تا ذکر کرنے والے ذاکرین کے ذکر کا سلسلہ بحمد اللہ زور و شور سے رہتا ہے جس کی پہلے سفر میں نوبت نہ آسکی تھی۔ اس کے بعد ایک بجے (عربی وقت سے) حضرت شیخ الحدیث اپنی تنہا چائے نوش فرماتے ہیں۔ مولانا انعام الحسن صاحب اور مولوی ہارون صاحب اس وقت تک اپنے کمرے میں آرام کرتے رہتے ہیں اور اپنی چائے اپنے کمرے ہی میں پیتے ہیں اس کے بعد وہ دونوں اور حرم کے اجتماع والے خواص مولانا محمد عمر وغیرہ حضرت شیخ الحدیث کے کمرے میں آجاتے ہیں اور تین بجے تک مختلف مسائل پر گفتگو رہتی ہے۔ تین بجے سے پانچ بجے تک حضرت شیخ نے مخصوص احباب کی ملاقات کے لئے وقت رکھا ہے اسی دوران میں مکہ کی مسجد میں خصوصی حجاج کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ آج ہندوستان پاکستان کے علماء کا اجتماع ہے کل افغانیوں کا تھا اس سے پہلے الجزائر وغیرہ کے مختلف اجتماعات ہوتے رہے ہیں ان میں حضرت شیخ کی بھی شرکت تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتی ہے اور مولانا انعام الحسن صاحب بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اسی وقت ان حضرات کی اہلیہ تعلیم بھی مدرسہ کے دو حجروں میں

ہو جاتی رہتی ہے۔

حضرت شیخؒ کی طبیعت پہلے سے بھی ناساز تھی، یہاں آ کر کچھ حرارت کا سلسلہ بھی مسلسل سا ہو گیا، اور اس سے زیادہ پیشاب کا سلسلہ بھی بے قابو ہو گیا، شاید اس میں زمزم کو بھی دخل ہو، اس لئے کہ یہاں آنے کے بعد اس وقت تک زمزم کے علاوہ دوسرا پانی بجز اس کے کہ جو بوتل میں ملا ہوا ہوتا ہے نوبت نہیں آئی، ظہر کی نماز ساڑھے بارہ بجے[1] ہوتی ہے، ظہر سے متصل کھانے سے فراغت کے بعد عصر تک قیلولہ ہوتا، عموماً کھانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا، لیکن دعوت کے دن جو اکثر ہوتی رہتی ہے قیلولہ میں بہت دیر ہو جاتی ہے، اگرچہ کھانے کے لئے کہیں جانا نہیں پڑتا، دعوت اپنے مستقر ہی پر ہوتی ہے، عصر ساڑھے تین بجے ہوتی ہے اس کے بعد حضرت شیخؒ نے قہوہ شروع کر دیا تھا، جو اچھا معلوم ہوتا، مگر اس سے نیند پر اثر پڑنے لگا، اس لئے بجائے اس کے سبز چائے شروع کر دی، اس دوران میں احباب بھی آتے رہتے ہیں، ۱۱ بجے سے حرم کی تیاری کے بعد ساڑھے گیارہ بجے سے ڈھائی بجے تک حرم میں سب کا قیام رہتا، اس دوران میں ان حضرات کے یہاں خصوصی ملاقاتیں، عمومی اجتماعات، اردو کے مختلف حلقے اور عربی کے مختلف حلقے ہوتے رہتے ہیں، دوسری زبانوں کے حلقے افغانی، ترکی، انگریزی وغیرہ چلتے رہتے ہیں، حضرت شیخ الحدیث پیشاب کی کثرت کی بنا پر ایک گوشہ میں تشریف فرما رہتے ہیں، ڈھائی بجے واپسی کے بعد تمام حضرات کھانا کھاتے ہیں، اور حضرت شیخؒ کچھ میوے تناول فرماتے ہیں، ۴ بجے حضرت شیخ

---

[1] اس سے مراد غروبی وقت ہے جو حجاز میں اذان وغیرہ کے سلسلے میں اب بھی رائج و متعارف ہے۔

مخصوص حضرات کے ساتھ حرم میں دوبارہ حاضر ہوتے ہیں اور گاڑی پر
بہت سے معذوروں کی وجہ سے تین چار طواف کرتے ہیں پیچھے پیچھے حرم سے واپس
پر حضرت شیخ آرام فرماتے ہیں اور دو بجے تہجد کی اذان اور ۵ بجے کے
قریب صبح کی نماز ادا ہوتی ہے۔"

حج سے فارغ ہو کر اور مکہ مکرمہ میں مختصر سا قیام کر کے مدینہ طیبہ روانگی ہوئی،
وہاں سے ۲۲ اپریل کو مکہ مکرمہ آمد ہوئی، دو تین دن وہاں قیام کے بعد جدہ اور ۲۶ کو
جدہ سے کراچی، وہاں سے ۲۸ کو دہلی روانگی ہوگئی، وہاں حسب توقع استقبال
کرنے والوں کا ہجوم تھا، بعد اور دو شب دہلی قیام کر کے پنجشنبہ ۳۰ اپریل کو دس بجے
کے قریب سہارنپور تشریف لائے، آتے ہی گھر میں وضو فرما کر مسجد تشریف لے گئے اور
دوگانہ ادا فرمانے کے بعد مجمع سے مصافحہ فرمایا، اعزہ، اقرباء اور خواص کسی سے بھی نماز
سے قبل مصافحہ نہیں کیا، اسی وقت بعد نماز عصر دعا کا اعلان ہو چکا تھا چنانچہ دار الطلبہ
جدید کی مسجد میں مولانا انعام الحسن صاحب نے دعا کرائی جس میں شہر اور مضافات
کے لوگوں نے شرکت کی، دو شنبہ کو صبح چائے کے بعد بعض حضرات مع بعض حضرات
گنگوہ تشریف لے گئے، اور کھانے کے وقت تک لوٹ آئے، ظہر کے بعد مولانا انعام الحسن
صاحب تو نظام الدین واپس گئے، اور حضرت شیخ نے بخاری شریف کا درس
شروع کرا دیا۔

شیخ کے معمولات و نظام الاوقات

شیخ کی زندگی اپنے علمی انہماک، خدمت خلق، یکسوئی اور شدید مصروفیت کے

اعتبار سے اس بیسویں صدی میں ان علمائے سلف کی زندہ یادگار تھی جن کا ایک ایک لمحہ عبادت و خدمت اور علم کی نشر و اشاعت کے لئے وقف تھا اور جن کے کارنامے دیکھ کر ان کے اوقات کی برکت، ان کی جفاکشی اور بلند ہمتی اور ان کی جامعیت کے سامنے آدمی تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا ہے اور ان کی روحانیت اور تائید الٰہی کے سوا اس کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد[1] کچا گھر[2] تشریف لے آتے اور ایک بڑی جماعت کے ساتھ چائے نوش فرماتے جن کی تعداد پچاس ساٹھ سے شاید کبھی کم ہوتی ہو، بعض دنوں میں اس سے بہت بڑھ جاتی، کچھ لوگوں کے لئے ناشتہ کا بھی انتظام ہوتا، لیکن اس وقت شیخ کا معمول صرف چائے پینے کا تھا، اگر کوئی ایسا عزیز یا اور اہم مہمان ہوتا، یا تھوڑے وقت کے لئے یہاں پہنچ آیا ہوتا، یا اس سے کوئی ضروری باتیں کرنی ہوتیں تو تخلیہ کر لیا جاتا، اور کچھ دیر وہیں تشریف رکھتے، پھر بالاخانہ پر اپنے علمی و تحقیقی معمولات پورا کرنے کے لئے تشریف لے جاتے، جاڑے گرمی برسات، حوادث، تعزیات اور کسی بڑے سے بڑے عزیز مہمان کی آمد کے موقع پر بھی اس میں کم فرق واقع ہوتا، بعض مرتبہ فرمایا کہ حضرت رائے پوری یا ایسے اکابر و مشائخ کی تشریف آوری کے موقع پر میں نے احتراماً اپنا یہ معمول ترک کر دینا چاہا تو سر میں درد ہو گیا، اجازت لے کر تھوڑی دیر کے لئے گیا، اور تھوڑا سا کام کر کے واپس آگیا، اکثر یہ حضرات خود ہی یا اصرار شیخ کو رخصت فرما دیتے

---

[1] اس وقت میں اب روز بروز طول ہوتا جا رہا تھا، پہلے فجر کی نماز کے کچھ ہی دیر بعد تشریف لے آتے تھے، اس کے بعد دیر تک تلاوت و وظائف میں مشغول رہنے لگے تھے، سوائے خاص مواقع کے کہ کوئی عزیز مہمان آیا ہوا ہو۔ [2] شیخ کا مکان اسی نام سے مشہور ہے۔

اور حرج گوارہ نہ فرماتے اوپر کی نشست گاہ دیدنی تھی نہ کہ شنیدنی ایک چھوٹا کمرہ جس میں کتابوں کا اس طرح ذخیرہ تھا گویا در و دیوار اسی کے ہیں ان کتابوں کے درمیان میں آپ بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی پرندہ جو دن بھر خیر جنس میں رہا ہے ابھی اپنے آشیانہ میں واپس آ گیا ہے اس وقت ان کا وہی حال ہوتا جس کی تصویر خواجہ میر درد نے اس شعر میں کھینچی ہے ؎

جا بیٹھے کس واسطے لے درد میخانہ کے بیچ

کچھ ہے مستی ہے اپنے دل کے پیمانہ کے بیچ

اگر کسی کو اس وقت کوئی ضروری بات کہنے کے لئے یا کسی عزیز مہمان کو ملنے کے لئے جانا پڑتا تو اس کو بمشکل بیٹھنے کی جگہ ملتی چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر ایک آدھ چھڑو یا چٹائی کا فرش کچھ پرانی شیشیاں اور دواؤں کی بوتلیں مگر جس میں معلوم نہیں کتنے علم کے جواہر اور اخلاص کی تب و تاب ہوتی ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے تک شیخ پوری یکسوئی کے ساتھ وہاں کام کرتے رہتے اور ان کا جی چاہتا کہ سوائے نہایت ضروری اور فوری کاموں کے خلل واقع نہ ہو ان اوقات میں ان خاص مہمانوں اور ذکر و شغل کرنے والے عزیزوں کو اجازت ہوتی کہ صحن میں بیٹھ کر ذکر جہر کرتے رہیں وہ کام میں مشغول رہیں اس سے شیخ کی یکسوئی میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا۔

ساڑھے گیارہ بجے تشریف لے آتے دسترخوان بچھتا مہمانوں کی جماعت کثیر شریک طعام ہوتی، عام طور پر ڈیڑھ اور تین مرتبہ مجمع بیٹھتا شیخ کی اصطلاح میں اس کو پہلی پیڑھی اور دوسری پیڑھی کہتے ہیں شیخ اول سے آخر تک کھانے میں شریک رہتے اپنے کھانے کی رفتار اور مقدار ایسی رکھتے کہ آخری کھانے والے کا ساتھ دے سکیں کھانے میں بالعموم

متنوع ہوتا متعدد قسم کے سالن وافر مقدار میں ہوتے اور بڑے اصرار سے مہمانوں کو کھلایا جاتا یہاں تک کہ نووارد اور ناتجربہ کار بعض اوقات اس اصرار سے اپنے معمول سے زیادہ کھا کر تکلیف بھی اٹھاتے لیکن غور سے دیکھنے والا معلوم کر لیتا کہ شیخ برائے نام شریک ہیں ان کی خوراک اتنی کم ہوتی کہ اس مقدار کے ساتھ اتنی محنت پر تعجب ہوتا لیکن دسترخوان پر ایسا سماں بندھتے کہ کسی کو پتہ نہ چلنے پاتا کہ یہ اخفا اور فراخ دل میزبان خود کس قدر اس کھانے میں شریک ہے۔

کھانے سے پہلے ڈاک آجاتی جس پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے۔ اس ڈاک کی مقدار روز بروز بڑھتی جارہی تھی، حجاز روانگی سے قبل کے زمانہ میں ۳۰-۴۰ کے درمیان روزانہ خطوط کا اوسط تھا، بعد میں ۵۰-۶۰ تک پہونچ گیا۔

کھانے کے بعد شیخ آرام کرنے لئے معذور ہوتے ساڑھے بارہ، ایک اس میں ضرور بج جاتا یہی وقت ان کے آرام کا ہوتا ظہر کے بعد ایک گھنٹہ وہ ڈاک اور اسی درمیان میں کسی عزیز مہمان سے گفتگو کی نذر کرتے، گھنٹہ ختم ہونے کے بعد حدیث کے درس کے لئے تشریف لے جاتے، پہلے یہ درس دارالطلبہ کے دارالحدیث میں ہوتا تھا جو بالائی منزل پر ہے پھر چڑھنے بلکہ چلنے تک کی معذوری کی بنا پر دارالطلبہ کی مسجد میں ہونے لگا، مولانا حافظ عبداللطیف صاحب کی وفات کے بعد سے بخاری شریف آپ ہی پڑھاتے تھے۔ اس درس کی کیفیت دیدنی تھی تر کشیدہ رقی، حدیث کے احترام، سنت کے شغف، اور ذات نبوی سے عشق کی کیفیت کا اثر تمام حاضرین پر پڑتا، اور بعض مرتبہ تو ساری مجلس پر ایک بجلی سی کوند جاتی خصوصاً ختم کتاب اور دعا کے موقعہ پر تو یہ سیلاب ہزار دوست دعا ظرفی کے باوجود چھلک پڑتا، اسی طرح وفات نبوی کی احادیث پڑھانے میں ضبط

ہاتھ سے چھوٹ جاتا، آنکھیں بے اختیار اشکبار اور آواز گلوگیر ہوجاتی۔

عصر کی نماز کے بعد مکان پر عام مجلس ہوتی۔ سہ دری کے صحن میں زائرین اور متعلقین سے بھر جاتا، اس میں مدرسہ کے طلبہ اور بعض اساتذہ بھی ہوتے اور مدرسہ کے مہمان بھی، چائے کا اس وقت بھی دور چلتا۔ تعویذ لکھنے کا اسی وقت معمول تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد دیر تک حجرہ میں رہتے۔ اگر کوئی خاص مہمان یا عزیز آئے ہوئے ہوتے تو ان کو خصوصی طور پر وقت دے دیتے۔ عشاء کی نماز سے پہلے دستر خوان بچھ جاتا لیکن شیخ کا عرصہ سے رات کو کھانے کا معمول نہیں رہا تھا، کوئی خاص عزیز مہمان ہوتے تو ان کی خاطر دو چار لقمے تناول فرما لیتے۔ عشاء کے بعد پھر کچھ مخصوص و محدود مجلس رہتی جس میں زیادہ تر بے تکلف اور ہر وقت کے حاضرباش خدام یا عزیز مہمان ہوتے پھر آرام فرماتے۔

جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے مختلف دیہاتوں اور اطراف و مواضعات سے آنے والے اہل تعلق و ارادت کو مجلس میں شرکت کی اجازت ہوتی ———
اسی موقع پر نئے طالبین کو بیعت بھی فرماتے اور ذکر و اصلاح حال کی تلقین بھی۔ یہ تعداد روز افزوں اتنی بڑھ رہی تھی کہ سارا صحن اور اندر کا سب بھر جاتا، پھر جمعہ کی تیاری ہوتی جس اب حکیم ایوب صاحب کی چھوٹی مسجد میں جو قریب ترین مسجد ہے ادا فرماتے۔ کھانا معمولاً و التزاماً جمعہ کے بعد ہوتا۔ عصر کی مجلس عام جمعہ کے دن ملتوی رہتی۔ شیخ کا برسوں سے جمعہ کے دن مابین عصر و مغرب دعا میں مشغول اور متوجہ الی اللہ رہنے کا معمول تھا، فرماتے تھے کہ والد صاحب کا بھی یہی معمول تھا، چائے بھی اس روز مغرب کے بعد ہوتی۔

شیخ کا ان سب علمی و تحقیقی اور دینی و روحانی مشاغل و معمولات کے علاوہ

(جن کی موجودگی میں فرصت عنقا معلوم ہوتی) ایک قدیم معمول اہم واقعات وحوادث وفیات اور اپنے بزرگوں احباب اور مخصوص خدام کی آمدورفت دورہ وسیر نقل وحرکت کے قلم بند کرنے کا بھی تھا جس کی حیثیت ایک مکمل و مفصل روزنامچہ کی سی ہے اس روزنامچہ میں قمری وشمسی سنہ ومہینہ اور تاریخ کی قید کے ساتھ گردوپیش کے اہم واقعات درج ہیں اسی کی مدد سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ حضرت رائے پوریؒ اور سب سے بڑھ کر مولانا محمد یوسف صاحب کی سوانح مرتب ہو سکی، مولانا مدنیؒ سے متعلق بھی اس کی بہت معلومات واندراجات ہیں ان بزرگوں کے علاوہ بہت سے خدام اور اہل تعلق کے آنے جانے اور ان سے تعلق رکھنے والے واقعات کی تفصیل ملے گی، یہ ایک طرح کا جام جہاں نما ہے جس میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے بھی بہت سے واقعات اور شخصیات کی سوانح وسنین اور تاریخیں ہیں حیرت ہوتی ہے کہ شیخ کو اتنی شدید مصروفیت میں اس کے لئے وقت کیسے مل جاتا تھا۔

اخبارات کے مطالعہ کا ہمیشہ معمول رہا، بڑے اہتمام سے روزانہ کے اہم اخبارات محفوظ رکھے جاتے اور شیخ ان کو فرصت سے مطالعہ فرماتے، دنیا کے حالات اور جماعتوں کے مزاج ورجحانات سے باخبری کا ہمیشہ ذوق رہا لیکن جب نزول الماء کی شکایت ہوئی اور آنکھیں شیشہ کی مدد کے بغیر مطالعہ نہیں کر سکتے تھے، اخبارات کے مطالعہ کا معمول تقریباً چھوٹ گیا، کبھی کوئی اہم مضمون ہوتا تو اس کو پڑھوا کر سن لیتے لیکن بہرحال ذوق ومیلان طبعی میں اب بھی کوئی فرق نہیں تھا۔

نزول الماء کی شکایت اور علی گڑھ کا قیام

آنکھوں میں نزول آب کا سلسلہ دسمبر ۱۹۶۹ء سے شروع ہوا تھا، مشغولیت اور آنکھ کے

پختہ نہ ہونے کی وجہ سے آپریشن کا معاملہ ٹلتا رہا۔ ۵ مارچ ۱۹۶۶ء (۱۴ ذی قعدہ ۱۳۸۵ھ) کو علی گڑھ کے مخلصین (جن میں حاجی عظیم اللہ صاحب وحاجی نصیر الدین صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں) اور احباب وخدام کے اصرار پر پہلی مرتبہ علی گڑھ کے مشہور آنکھ کے اسپتال گاندھی آئی ہاسپٹل میں داخل ہوا۔ ۱۳ مارچ سنہ ء کو دائیں آنکھ کا آپریشن اسپتال کے مشہور سرجن اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر امراض چشم ڈاکٹر شکلا نے کامیاب طریقہ پر کیا۔ شیخ بغیر علمی مشغولیت اور افادہ وارشاد کے رہ نہیں سکتے، پڑھنے لکھنے کا کوئی سوال نہ تھا، جب بولنے کی اجازت ہوئی تو اپنی زندگی کے سبق آموز حالات، اپنے اساتذہ ومشائخ کے کمالات اور طرز زندگی، اخلاص وایثار کے واقعات خدام کو سناتے جس کے قلم بند کرنے کا انھوں نے سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سے "آپ بیتی" کا وہ مفید سلسلہ شروع ہوا، جو بالآخر سات حصوں میں مکمل ہوا اور جو دور ماضی کی ایک بولتی ہوئی تصویر اور جیتا جاگتا مرقع بن گیا، جو علماء واساتذۂ مدارس اور تذکرہ داران بساط علم کے لئے خاص طور پر چشم کشا اور بصیرت افروز ہے۔

اس اسپتال میں دوبارہ داخلہ ۲۰ اگست ۱۹۶۶ء (۴ جمادی الآخرہ ۱۳۸۶ھ) میں ہوا۔ اس مرتبہ ۳۰ روز (۲۲ اگست - ۲۰ ستمبر) قیام رہا، یہاں بھی افادہ وارشاد کا سلسلہ جاری رہا، ڈاک اس پر مستزاد تھی، صرف ایک دن کی ڈاک میں باون خطوط ہندوستان، پاکستان، حرمین شریفین، لندن وافریقہ کے تھے۔[1]

دو برس کے بعد دوسری آنکھ بنوانے پر اصرار شروع ہو گیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ء کو مدینہ طیبہ کے اسپتال میں لاہور کے مشہور آئی سرجن ڈاکٹر منیر الحق صاحب نے بائیں آنکھ کا آپریشن کیا

---

[1] آپ بیتی ۶ اختصاراً

۲۸ / اپریل کی صبح کو اسپتال سے مدرسہ علوم شرعیہ واپسی ہوئی جہاں قیام تھا۔[1]

تدریس سے معذوری

شوال ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۳ء) سے کتب حدیث کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا تھا جو ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء) تک جاری رہا، اس کے بعد نزول الماء کی وجہ سے تدریس کا سلسلہ چھوٹ گیا، لیکن تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔[2]

تدریس کا سلسلہ اگرچہ ۱۳۸۸ھ سے معذوری کی بنا پر موقوف ہو گیا، لیکن مسلسلات کی اجازت دینے کا سلسلہ سہارنپور کے قیام کے آخر تک جاری رہا، ۲۲ رجب ۱۳۹۰ھ کو مسلسلات کے موقع پر تقریباً ڈیڑھ ہزار کا مجمع ہو گیا تھا جس میں اکابر و خواص بھی بہت سے ہو گئے تھے۔[3]

---

[1] آپ بیتی ۲ ص ۲۵۹ [2] ایضاً ص ۲ [3] ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

علمی سیاں وہیت ہی امراض کا شکار رہوں لیکن تمام تالیف کے اندر آرام و راحت

ہے البتہ آنکھوں کی تکلیف سے تکلیف ہے اس وجہ سے کہ بخاری کا سبق معذوری ہو گئی باوجود

شدید اصرار کے مدرسہ اولیٰ بخاری نہیں پڑھا سکا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا سکا ہوں (اسرار نامہ)

[3] اللہ تعالیٰ کا حضرت شیخ کے ساتھ یہ بھی خاص معاملہ تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اور اپنی نگرانی میں اپنے خصوصی فن حدیث میں کچھ شاگردوں کو تیار فرما دیا تھا، ان میں مولانا محمد یونس صاحب جونپوری و مولوی محمد عاقل صاحب سہارنپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اول الذکر کو شیخ نے اپنے سہارنپور کے قیام کے دوران تدریس حدیث کی مسند پر بٹھا دیا اور انھوں نے ۱۵ شوال ۱۳۸۸ھ سے بخاری کا درس شروع کیا، افتتاح حضرت شیخ نے کرایا، مولوی عاقل صاحب کو بھی شیخ نے اپنے تحریری و تحقیقی کاموں میں شریک کر کے (باقی صفحہ پر)

ایسا ہوا ہے، اس لئے اس کی دعوت دی جاتی ہے، میں نے شیخ کو اس مجلس میں انتظام کی اطلاع دی تھی، اس سے ان کو فرحت و مسرت ہوئی اور میں عزیز گرامی مولوی معین الدین ندوی اور مولوی سعید الرحمٰن ندوی کی معیت میں دہلی سے منتقل ہوگیا، ۲۰ صفر ۱۳۹۶ھ / ۲۲ اپریل ۱۹۷۶ء یوم شنبہ کو دہلی سے ہوائی جہاز سے بمبئی روانگی ہوئی، الحاج ابو الحسن شیخ کی جھولی میں تھے، راستہ میں مسافروں کی مٹھائی سے جو تواضع کی جاتی ہے میں نے اس میں سے کچھ شیخ کی خدمت میں پیش کیا تو فرمایا کہ مولوی صاحب میں روزہ سے ہوں، معلوم ہوا کہ شکرانہ اور مسرت کا روزہ ہے، اور شیخ نے جیسا کہ "آپ بیتی" سے معلوم ہوا یہ سفر روزہ اور وضو کی حالت میں مکمل کرنے کا عزم فرمایا تھا جو پورا ہوا۔

۲۹ اپریل شنبہ کو بمبئی سے کراچی روانگی ہوئی، کراچی کے ہوائی اڈہ پر بہت بڑا مجمع تھا، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی بھی تشریف فرما تھے، ظہر پڑھ کر زیارت اور خصوصی دعا ہوئی، پھر جدہ کے لئے کوچ ہوا، اس سفر میں شیخ نے بقول خود [illegible] من اللہ" کی نیت کر لی تھی، اور احباب و اکابر کے شدید اصرار کے باوجود خیبر کے سفر تک اس کا سلسلہ رہا۔

مدینہ طیبہ کی اس قیام میں جب شیخ نے مسلسل دو مہینوں کے روزے کی نیت کی تھی، معمول یہ تھا کہ مغرب سے پہلے باب جبریل سے داخل ہوکر مواجہ شریف کی طرف جاتے ہوئے دائیں جانب کو جو متصل دیوار ہے وہاں اقدام عالیہ کے رخ پر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتے اور سوائے نمازوں کے مراقب رہتے، اسی میں افطار کا وقت ہو جاتا، تو زمزم کا ایک گلاس نوش فرما لیتے، پھر مسلسل عشاء تک کچھ کھائے پیئے بغیر مراقب رہتے، اس حالت میں کسی کی طرف توجہ کرنا یا بات کرنا بہت گراں ہوتا، عشاء کی

کے ساتھ جوان کی طبیعت تاثیر بن گئی تھی۔ مولانا مدنیؒ، مولانا رائے پوری اور مولانا
محمد یوسفؒ کے ساتھ اضلاع سہارنپور، میرٹھ، مظفر نگر، مراد آباد، بریلی اور میوات کے
چھوٹے چھوٹے سفر ان حضرات کی رفاقت، اہم مدارس کے جلسوں اور تبلیغی اجتماعات
کی شرکت کے لئے وقتاً فوقتاً کرنے پڑتے تھے، ان سفروں کی تعداد جن کی نوبت
سال میں کئی کئی بار آجاتی تھی، اور جن کی تفصیل مشکل ہے آپ نے بعض دور کے
اضلاع کے سفر بھی فرمائے جن میں تین سفر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان سفروں میں ایک لکھنؤ کا سفر تھا، جو رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں حضرت
مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ایماء پر لکھنؤ کی تبلیغی جماعت اور تبلیغی کام کے ذمہ داروں
کی دعوت پر منظور کیا گیا تھا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ ۸ جولائی کو لکھنؤ تشریف
لائے، دوسرے روز ۹ جولائی کو شیخ کی سہارنپور سے براہ راست تشریف آوری ہوئی
اس موقع پر مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالحق صاحب مدنی، مولانا احتشام الحسن
صاحب، حافظ فخر الدین صاحب (خلیفہ مجاز حضرت سہارنپوریؒ) اور تبلیغی جماعت
کے متعدد علماء و کارکنان موجود تھے، کئی روز لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمانخانہ
میں قیام رہا اور تبلیغی اجتماعات اور مجالس میں شرکت رہی۔

لکھنؤ کے قیام کے آخری ایام میں ایک روز کے لئے حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ
ان کے ممتاز رفقاء اور خدام کی معیت میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبی و معنوی و منشاء
وانہ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ کی جو شہر میں تکیہ کلاں کے نام سے مشہور ہے تشریف لائے
اور بہت مسرور و محظوظ ہوئے۔

دوسری مرتبہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی معیت میں [illegible] آباد ضلع لکھنؤ

کے ایک اہم تبلیغی اجتماع میں جو ۳-۴-۵ جمادی الثانیہ [illegible] بروز [illegible] کو
موضع باقی نگر میں وہاں کے رئیس الحاج شیخ فیاض علی صاحب کی دعوت و تحریک پر
منعقد ہوا تھا، رحیم آباد تشریف لائے۔ اس اجتماع میں سوائے حضرت مدنیؒ کے جو
اس زمانہ میں الٰہ آباد کے نینی جیل میں اسیر فرنگ تھے، ملک کے ممتاز ترین علماء و مشاہیر
شریک ہوئے، جن میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی، مولانا قاری
محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی، مولانا عبدالحق
صاحب مدنی، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ
ناظم ندوۃ العلماء، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس اجتماع کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ قیام و طعام میں کوئی
تمیز و تفریق نہیں برتی گئی، عوام و خواص، علماء و مشائخ سب ایک جگہ ٹھہرے، ایک طرح
کا کھانا کھایا، تعلیم و تبلیغ گشت و اجتماع میں یکسانیت برتی گئی، اس سہ روزہ اجتماع
میں جس میں مختلف الخیال لوگ جمع تھے، کسی کو شکایت کا موقع نہ ملا، حضرت شیخ اپنی یادداشت
لکھتے ہوئے خاص طور پر اس خصوصیت کو نوٹ فرماتے ہیں۔

"اس اجتماع کی ایک بڑی خاص بات یہ تھی کہ مقامی مصلحت کی بنا پر کھانے
میں کوئی تفریق نہیں کی گئی، سارے مجمع کو بلا تخصیص ایک ہی نان اور دال سے
(دو وقتوں کے علاوہ) گیہوں نان اور شوربا سے تواضع کی گئی"[1]

اور ہوگے ان دو سفروں کے علاوہ آپ کا تیسرا سفر لکھنؤ اور رائے بریلی کا فروری
١٩٤٦ء میں پیش آیا، اس سفر میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ، مولانا

---

[1] سوانح حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کاندھلوی۔ باختصار ص ۲۲۱-۲۲۲

محمد یوسف صاحبؒ پیر ہاشم جان (جو سندھ کے ایک مشہور بزرگ اور سلسلۂ مجددیہ
کے شیخ تھے) الحاج سید محمد خلیل صاحب ٹھٹوی اور مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی
کی معیت میں ہوا۔ حضرت شیخ مولانا وارث پوری اور بڑی جماعت کے ساتھ براہ کانپور لکھنؤ
پہونچے، دو دن لکھنؤ قیام کرنے کے بعد ۹ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ / ۱۳ فروری ۱۹۲۶ء
کو اس پورے قافلہ کا مستقل لاری کے ذریعہ رائے بریلی ورود ہوا۔ حضرت شاہ علم اللہ
(جد امجد حضرت سید احمد شہیدؒ) کی مسجد کے سامنے دریا کے دوسرے کنارے یہ مبارک
قافلہ اترا اور کشتی سے دریا عبور کرکے شاہ علم اللہ صاحبؒ کے دائرہ میں داخل ہوا۔
استقبال کے لئے بستی کے سامنے حضرات نیز اصحاب شیخ موجود تھے۔ ایک ہفتہ روز
قیام رہا جو عجیب کیف و سرور کا تھا۔ راقم سطور جب صبح حضرت شیخ کو وضو کرانے لگا
(اسی دن واپسی تھی) تو شیخ نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا کہ مولوی صاحب یہاں سے
جانے کے لئے دل بہت بُرا ہو رہا ہے۔"

حوادث و سوانح

شیخ کو پے در پے ایسے سنگین و جاں گداز حوادث و سانحات پیش آئے، جو
طبیعت کو مستقل طور پر پژمردہ اور افسردہ، ہمت کو ختم کر دینے اور سینہ کو داغ داغ
بنا دینے کے لئے کافی تھے، لیکن شیخ کا حال وہ تھا جس کی کسی عارف شاعر نے تصویر
کھینچی ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش　　اگر ریش بینند و گر مرہمش
شرابِ محبت دمادم کشند　　اگر تلخ بینند دم درکشند

اس میں پہلا حادثہ شفیق و باکمال مربی اور ولی نعمت باپ کی وفات کا حادثہ تھا جو عین عنفوان شباب (۱۹ سال کی عمر) ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ میں پیش آیا۔ اس حادثہ سے نہ صرف دل و دماغ مجروح ہوئے بلکہ ذمہ داریوں کا ایک پہاڑ اور قرض کا ایک بار سر پر آ پڑا جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گذر چکی ہے۔ اس کے بعد تقریباً ایک ہی سال کے اندر ۲ رمضان المبارک (۱۳۳۵ھ) کی شب قدر میں شفیق والدہ کی رحلت کا حادثہ پیش آیا۔

پھر ماں باپ سے بڑھ کر شفیق و محبوب شیخ و مربی روحانی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو ارتحال فرمایا۔ اس وقعہ پر شیخ کو کہنے کا حق تھا ؎

حال من در ہجر حضرت کمتر از یعقوب نیست — او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردہ ام

۵ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں انہیں نے داغ مفارقت دیا۔ پھر ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ (۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء) کو سراپا شفقت اور محبوب و غمگسار عم نامدار حضرت مولانا محمد الیاس کی وفات کا سانحۂ عظیم پیش آیا جس کی اہمیت و سنگینی اور دوررس اثرات و نتائج اور حسرت خاندان والا شان نہیں بلکہ دین و ملت کے خسارۂ عظیم کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، شیخ نے اس کو بھی اپنی ایمانی قوت تعلق باللہ اور بے نظیر ہمت و استقامت سے ایسا برداشت کیا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو گئی اور ان کو اپنے تاثر اور غم و اندوہ پر شرم آنے لگی۔ راقم سطور کو خوب یاد ہے کہ تدفین سے فارغ ہو کر وہ بنگلہ والی مسجد کی سوگوار اور دل فگار فضا میں ٹھہرنے کی تاب نہ لا سکا اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہمایوں کے مقبرہ کی طرف چلا گیا، نماز مغرب سے فارغ ہو کر تاخیر سے جب حاضر ہوا تو شیخ نے بڑی شفقت

کے ساتھ فرمایا۔ مولوی صاحب کہاں چلے گئے تھے؟ اتنے میں تو سب ہوگیا۔ کیا تمہیں وہ حدیث یاد نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مصیبت آئے تو میری وفات کا صدمہ یاد کرے کہ امت کے لئے اس سے بڑا کوئی صدمہ نہیں ہوسکتا۔ اتنے میں دسترخوان بچھا دیا گیا تو پھر بڑی شفقت سے چیزیں پیش کرتے رہے اور اصرار سے کھلاتے رہے۔

اس کے بعد ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ / ۲ اپریل ۱۹۶۵ء میں قوت بازو اور قرۃ العین اور سرمایہ صد فخر محب ومحبوب بھائی مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کی ناگہانی خبر ملی جو بجلی بن کر دل ودماغ پر گری۔ لیکن شیخ نے حضرت ایوب کی برداشت کی اور "رضا بالقضاء" کا ثبوت دیا بلکہ "راضی برضا" ہونے کا ایسا منظر دیکھنے میں آیا جو حضرات اولیائے متقدمین کے حالات میں ملتا ہے بلکہ دوسروں کے لئے وجہ قوت وتسکین بن گئے۔ آپ بیتی میں تحریر فرماتے ہیں:-

"مورخہ ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۲ اپریل ۱۹۶۵ء بروز جمعہ عزیز مرحوم کی سہارنپور آنے کی اطلاع تھی جمعہ کی صبح کو عزیز مرحوم کی بیماری کا تار آیا ...... مجھے بیماری کا یقین تو نہ آیا۔ میں جمعہ کی نماز کے لئے غسل کرکے سونے کے ارادے سے لیٹا تھا کہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب عزیز طلحہ نے آکر مجھے اٹھایا اور کہا کہ صابری صاحب کا آدمی کھڑا ہے لاہور سے فون آیا ہے کہ ماموں جان حضرت جی کا انتقال ہوگیا۔ موت کے لئے تو کوئی وقت ہے نہ اس میں کوئی استبعاد میں اٹھ کر وضو کرکے مدرسہ کی مسجد میں جا بیٹھا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ بعد میں طلحہ طلحہ کی اس روایت کے ساتھ ساتھ ہی چاروں طرف سے ٹیلیفون آنے شروع کردیا اور مجھے ایسے وقت میں اخبار میں "کہ کیا ہوگیا؟ کیسے ہوا؟ کچھ کہنے کی

کون حیران ہو؟ لغویات سے بہت ہی وحشت ہوا کرتی ہے کہ یہ ایام اور قیمتی
وقت بہت ہی مبارک ہوتا ہے جس میں طبیعت منقطع عن الدنیا منتقل
الی الآخرۃ ہوتی ہے اس وقت کی تلاوت بھی قیمتی اور ذکر و فکر بھی قیمتی مجھ پر تھا
ہی چھا گیا، سیدھا مدرسہ آکر سب کچھ گیا اور میں نے تکبیر تک سلام پھیر کر ہی
نہ دیکھا عصر کی تکبیر پر سلام پھیرا، دور گھر گیا، وہاں خبر پہنچ چکی تھی ......
میں نے بند دروازہ پایا گھبرائی ہوئی آواز میں کہا کہ دو حافظ تو تم نے بن کی لیا
بہت مشغول رہے تمہارے پاس عشاء کے بعد آؤں گا اس سے پہلے پڑھنے
پڑھانے میں لگی رہو دروازہ سے نکلا تو گھر سے مدرسہ قدیم تک جو مجمع تھا
میں ترش روئی کے ساتھ ان دوستوں سے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے تو اس وقت کچھ
ضروری پڑھانا ہے آپ لوگ یہاں تشریف رکھیں، اس گفتگو کے بعد مجمع منتشر
ہو گیا اور میں مسجد میں جا کر بیٹھ گیا۔[1]

اس کے بعد ۲۹ شعبان ۱۳۸۳ھ کو اپنے لخت جگر نواسہ مولوی محمد ہارون کے انتقال
کا واقعہ پیش آیا جو ان کے بھی چشم و چراغ تھے اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور
حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی بھی واحد یادگار، اس جوان سال اور ہونہار نواسہ کی
وفات کی خبر جس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں[2]، شیخ کو مظفر میں ہوئی رمضان
کا زمانہ تھا شیخ نے تاکید کی کہ ابھی بچیوں کو خبر نہ کی جائے کہ گھر میں کوئی سحری نہ کھا سکے گا
سو کر اٹھنے کے بعد بچیوں کو بلایا اور کہا کہ تمہیں میرا قانون معلوم ہے کہ رنج و غم فطری چیز ہے

---

[1] آپ بیتی ج ۲ ص ۹۰ [2] ایضاً ص ... [3] مولوی ہارون کی عمر انتقال کے وقت ۲۳ سال تھی حالات و تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو عزیزی مولوی محمد ثانی مرحوم کی کتاب "تذکرہ مولوی محمد ہارون" کاندھلوی۔

کو ان کا انتقال ہوا، اور قیام گاہ کے عقبی حصہ میں دفن ہوئیں۔ اسی زمانہ میں جب آگ بھی بند تھی، آمد و رفت کا تو ذکر ہی کیا، شیخ کے عزیز داماد مولوی سعید الرحمٰن کاندھلوی کا جوانی ہی میں انتقال ہوا، اس کی اطلاع بھی شیخ کو دو ماہ بعد ملی۔ سہارنپور سے دہلی اور دہلی سے سہارنپور کا راستہ بالکل بند تھا، ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ (۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء) کو مولانا مدنی بڑی دقت سے دہلی پہونچے۔ مولانا کو ایک سرکاری ٹرک دیا گیا، اور مسلح پولیس حفاظت کے لئے، ۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو شیخ مع مستورات اس ٹرک سے سہارنپور واپس ہوئے۔ راستہ میں بڑی مشکلات پیش آئیں، راستہ میں ٹرک خراب ہو گیا، اور بڑا خطرہ پیدا ہو گیا، الحمد للہ کہ سب بخیریت سہارنپور پہونچے۔

۱۱ محرم ۱۳۶۷ھ کو مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے اور حضرت رائے پوری رائے پور سے سہارنپور تشریف لائے، اور وہ تاریخی مجلس منعقد ہوئی جس کے نتیجہ میں ان تینوں حضرات نے ہندوستان میں قیام کا فیصلہ کیا، بلکہ ضلع سہارنپور، میرٹھ اور پورے مغربی یوپی کے علاقے کے مسلمان جمے رہے۔[1]

سہارنپور کے مخلص و مخصوص خدام

اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ اس کا اپنے اکثر مقبول و محبوب بندوں کے ساتھ معاملہ رہا ہے، شیخ کو ایسے جان نثار، مزاج شناس اور خدمت گذار خادم عطا فرمائے، جو عام طور پر بڑے بڑے رؤسا و امراء کو نصیب نہیں ہوتے۔ ان میں شیخ کے ایک خادم خاص مولوی عبدالمجید صاحب تھے، جنھوں نے اپنے کو حضرت شیخ کی خدمت کے لئے

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی" ج۵ ص ۲۴-۳۰ ۔ و سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری ص ۱۲۵

وقف کر دیا تھا، اور دروازہ پر آکر پڑ گئے تھے، شیخ ان کی جفاکشی، چھوٹی چھوٹی ضروریات و مرغوبات کے مہیا کرنے میں ان کی جانفشانی اور مزاج دانی کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے تھے، شیخ کی وفات سے کئی سال پیشتر ان کا انتقال ہو گیا۔[1]

ان کے چچا مولانا نصیر الدین صاحب مہتمم کتب خانہ یحیوی ناظم امور المدارس شیخ کے یہاں ناظم الامور و "دار الاہتمام" کا درجہ رکھتے تھے، ناشتہ اور دونوں وقت کھانے کی تیاری اور مہمانوں کی نگہداشت انھیں کے ذمہ تھی، شیخ کو مہمانوں کی تعداد اور آمد و خرچ سے کوئی بحث نہ تھی، اس لیے کتب خانہ کی آمدنی اور شیخ کے وقتاً فوقتاً عطیے کافی تھے، رمضان مبارک میں خاص طور پر ڈیڑھ دو سو اور آخر میں کئی کئی ہزار مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام انھیں کے ذمہ تھا، جو وہ بڑے صبر و تحمل اور فراخ دلی سے انجام دیتے تھے، شیخ کی زندگی ہی میں ۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۱ھ (۱۱ مارچ ۱۹۸۱ء) کو انھوں نے انتقال کیا، اور شیخ کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔

ان دونوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے شیخ کو ایک اور مخلص خادم عطا فرمایا جن کو بعد میں مزاج دانی اور راحت رسانی کی وجہ سے وہ قرب و اختصاص حاصل ہوا جو بہت سے قدیم خدام کو حاصل نہیں ہوا تھا، راقم کو یاد ہے کہ حضرت رائے پوری کے بہٹ ہاؤس سہارنپور میں طویل قیام (سنہ ۱۳۷۴ھ سنہ ۱۹۵۵ء) کے زمانہ میں دو تین نوجوانوں نے شیخ کے پاس آنا جانا شروع کیا، ان میں سے ایک جلد مانوس اور قریب ہوتا چلا گیا، اور بالآخر اس نے گویا قدم پکڑ لئے، صورت و سیرت میں تیزی کے ساتھ تبدیلی آنی شروع ہوئی، اور حضرت شیخ کو بھی اس کے فہم و سلیقہ اور مزاج دانی کی ادا پسند آئی، اور انھوں نے بھی اس کو

---

[1] ۲۴ شعبان المعظم سنہ ۱۳۷۰ھ (۳۰ مئی سنہ ۱۹۵۱ء) کو ان کا انتقال ہوا۔

زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقعہ دیا۔ یہ الحاج ابوالحسن تھے جو سہارنپور کے اسلامیہ کالج میں اسسٹنٹ کلرک اور اسٹینوگرافر تھے۔ ان کا خدمت کا انہماک اور شیخ سے اختصاص اتنا بڑھا کہ کالج کی ملازمت کو بھی جواب دیا۔ شیخ کے حجاز و پاکستان کے اسفار میں مستقل ہمرکابی کا شرف حاصل کرنے لگے اور بالآخر مدینہ جا کر قدموں ہی میں پڑ گئے اور آخری ساعت تک قدموں ہی میں رہے۔

باب پنجم

حضرت شیخ کی زندگی میں رمضان المبارک کا اہتمام ومعمولات اور اس کے غیر معمولی اجتماعات

عارفین وصالحین کے یہاں رمضان کا استقبال واہتمام

رمضان المبارک نزولِ قرآن کی سالگرہ، رحمتوں اور برکات وتجلیات کا مہینہ، طاعات وعبادات کی بہار کا زمانہ اور روحانیت کا جشنِ عام ہے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان مبارک میں اعمالِ خیر کے بارے میں تیز ہوا آندھی سے بھی آگے رہتے تھے[1] حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان کا اخیر عشرہ آتا تو آپ پوری رات بیدار رہتے گھر والوں کو بیدار فرماتے اور عبادات اور نوافل کے لئے کمر کس لیتے[2] عارفین مشتاق اور عالی ہمت خاصانِ خدا کی بڑی مرادوں بر آنے کا وہ موسم اور ان کا محبوب ترین مہینہ ہے جس کے لئے وہ سال بھر دن گنتے رہتے ہیں اولیاء متقدمین کا ذکر نہیں، بعض زمانہ ما بعد بزرگوں کے متعلق سنا گیا ہے کہ عید کا چاند دیکھتے ہی آنے والے رمضان کا انتظار شروع ہو جاتا تھا[3] رمضان المبارک آتے ہی ان میں ایک نیا جوش وولولہ اور ایک

---

[1] بخاری ومسلم [2] ایضاً [3] ایک صاحب علم وتقویٰ دور آخر کے ایک بزرگ مولانا سید شاہ ضیاء الدین ... کے متعلق لکھتے ہیں۔

٭ آمد رمضان سے اتنے خوش ہوتے تھے کہ کئی مہینے پہلے سے ذکر کیا کرتے تھے کہ اب رمضان کے آنے میں اتنے مہینے باقی ہیں، رمضان کے جانے سے غم ... اس طرح ... کے سچے مصداق آپ ہی تھے۔

نئی نشاط و امنگ پیدا ہو جاتی تھی، اور وہ کبھی زبان حال سے یوں گویا ہوتے تھے ؎

ھذا الذی کانت الایام تنتظر

فلیوف للّٰہ اقوام بما نذروا

(یہ وہ دولت ہے جس کا زمانہ کو انتظار تھا۔ اب آ گیا ہے کہ نذر ماننے والے اپنی

نذریں پوری کریں۔)

اور کبھی کیف و سرور میں آکر یوں گنگنانے لگتے تھے ؎

پلا ساقیا وہ مئے دل فروز

کہ آتی نہیں فصل گل روز روز

رمضان المبارک کے آتے ہی دینی و روحانی مرکزوں اور خانقاہوں کی فضا بدل جاتی تھی، ان لوگوں کے علاوہ جو وہاں مستقل طور پر قیام پذیر ہوتے تھے، شیخ و مرشد سے بیعت و عقیدت کا تعلق رکھنے والے دور دور سے اس طرح کھنچ کھنچ کر آجاتے تھے جیسے آہن پارے مقناطیس کی طرف، اور پروانے شمع کی طرف آجاتے تھے، یہ روحانی مرکز ذکر و تلاوت اور نوافل و عبادات سے اس طرح معمور ہو جاتے کہ گویا دن میں اس کے سوا کوئی کام ہی اور رمضان کے بعد پھر کوئی رمضان آنے والا نہیں، ہر شخص دوسرے شخص سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا، اور رمضان کے پہروں کو صرف رمضان ہی کا نہیں اپنی زندگی کا آخری دن سمجھتا، اور خواجہ میر درد کے اس شعر کی سچی تصویر اور عملی تفسیر بن جاتا ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جس قدر بس چل سکے ساغر چلے

جو خدا کا بندہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اس ماحول میں آجاتا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر

ہوجاتا، افسردہ طبیعتوں میں نئی گرمی، بلکہ سرگرمی، پست ہمتوں میں عالی ہمتی اور اولوالعزمی، بلکہ مردہ دلوں میں زندہ دلی اور بلند پروازی پیدا ہوجاتی، بجلی کا ایک کرنٹ تھا جو دلوں سے دلوں کی طرف پہونچ جاتا، اور مردہ جسموں میں ایک بجلی سی پیدا کردیتا، جو شخص اس روحانی و ملکوتی فضا کو دیکھتا اس کا قلب شہادت دیتا کہ جب خدا طلبی کا یہ ہنگامہ برپا ہے اور دین و روحانیت کی شمع کے پروانوں کا ہجوم ہے، اور ہر قسم کے دنیوی اغراض اور نفس پرستی و دنیا طلبی سے بالاتر ہوکر خدا کو راضی کرنے اور اپنی آخرت کو بنانے کے لئے اتنے آدمی کسی جگہ جمع ہیں، دنیا تباہ نہ ہوگی اور زندگی کی اس بساط کو تہہ کرنے کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اس وقت وہ بے اختیار خواجہ حافظ کے الفاظ میں اس طرح گویا ہوجاتا تھا۔

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است

عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

افسوس ہے کہ آٹھویں صدی میں سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ غیاث پور (دہلی) اور تیرہویں صدی میں حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کی خانقاہ مظہریہ واقع چتلی قبر (دہلی) کے رمضان المبارک کا آنکھوں دیکھا حال کسی مؤرخ نے نہیں لکھا، اور وہاں ذکر و تلاوت کی سرگرمی، شب بیداری اور روزانہ کا نظام الاوقات کسی کتاب میں تفصیل سے نہیں ملتا، لیکن "فوائد الفواد" "سیر الاولیاء" اور "درّ المعارف" میں اس کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں، جو شخص ان خانقاہوں کے شب و روز، اور ان شیوخ کے ذوق و شوق اور ساز و سوز سے واقف ہے وہ ان نقطوں سے پوری تحریر، اور ان نامکمل خطوط سے پوری تصویر تیار کرسکتا ہے کہ

تیا مرکت زگلستان سنا بہار مرا

لیکن جن خانقاہوں اور روحانی مرکزوں کے حصے میں ان خانقاہوں کی وراثت اور جن علماء و مشائخ کے حصے میں ان بزرگان سلف اور مشائخ چشتیہ کی نیابت و خلافت آئی، انھوں نے ان سنتوں کو تازہ اور زندہ کر دیا، اور تاریخ نے ان کے عہد میں اپنے آپ کو دہرا دیا۔

وہ لوگ تو فانی خیال ہوں گے جنھوں نے گنگوہ میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے زمانہ میں رمضان کی بہار دیکھی ہے لیکن وہ لوگ بکثرت موجود ہیں جنھوں نے گنگوہ کے دور کے بعد شیخ وقت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کے دور میں رائے پور میں اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے دور میں تھانہ بھون میں رمضان کی بہار دیکھی اور جس وقت وہ اس زمانہ کو یاد کرتے ہیں ان کے دل پر ایک چوٹ لگتی ہے۔[1]

مولانا مدنیؒ اور رمضان کا اہتمام

ہمارے علم میں اس اخیر دور میں جس نے اسلاف کی اس سنت دیرینہ کو زندہ کیا اور اس کو نئی آب و تاب بخشی وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی ذات بابرکات تھی، انھوں نے اپنے مخصوص طالبین و مخلصین کی درخواست پر کسی ایک جگہ قیام کر کے رمضان المبارک کے گذارنے کا معمول بنا لیا، اور اطراف و اکناف

---

[1] حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے دور میں رمضان میں جو مجمع، پانچ سو سے زیادہ کا مجمع ہوتا تھا۔
(آپ بیتی نمبر ۲ صفحہ ۶۹)

بلکہ ملک کے دور دراز گوشوں سے منتسبین اور ارادت مند پروانہ وار جمع ہونے لگے۔ حضرت نے ایک عرصہ تک سلہٹ میں رمضان المبارک گذارا، پھر کئی سال بانس کنڈی (بنگال) میں رمضان گذارا، ایک دو سال اپنے وطن مالوف الہ داد پور متصل ٹانڈہ ضلع فیض آباد (خاص اپنے دولت خانہ پر) رمضان المبارک گذارا، ان سب مقامات پر سیکڑوں کی تعداد میں مریدین و خدام اور اس ماہ مبارک کے قدر دان جمع ہوتے جو آپ کے مہمان ہوتے، آپ ہی ان مقامات پر قرآن شریف سناتے، لوگ ذکر و شغل تلاوت و عبادات میں پوری سرگرمی و عالی ہمتی سے مشغول رہتے، خدام کو بڑی کیفیات و ترقیات محسوس ہوتیں، اور وہ عرصہ تک مزے لے لے کر ان پُرکیف و پُرنور ساعتوں کا ذکر کرتے۔[1] اگر اللہ کو منظور ہوتا اور مولانا کی زندگی وفا کرتی تو غالباً الہ داد پور میں یہ مبارک سلسلہ جاری رہتا، اور خدا جانے کتنے بندگان خدا اپنی مراد کو پہونچتے، اور تربیت و تکمیل کے مدارج طے کرتے، لیکن مولانا کی وفات (یوم جمعرات ۱۳ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء) نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا، اور لوگ کف افسوس ملتے رہ گئے۔

رائے پور اور دوسرے مقامات کا رمضان

مرشدنا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کے یہاں بھی رمضان کا غیر معمولی اہتمام تھا، تقسیم سے پہلے پنجاب کے اہل تعلق جن میں ایک بڑی تعداد علماء، اہل مدارس اور صاحب اجازت مشائخ کی ہوتی تھی شعبان کی آخری تاریخوں میں

---

[1] ملاحظہ ہو مولوی عبدالحمید اعظمی کا رسالہ "قیام سلہٹ" ۱۳۶۲ھ اور حضرت شیخ کی کتاب "اکابر کا رمضان"

رمضان گذارنے کے لئے رائے پور آجاتے اور پھر پوری یکسوئی وانہماک کے ساتھ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر دنیا سے الگ تھلگ اس گاؤں میں جس کو شہر سے ملانے والی کوئی پختہ سڑک بھی نہیں اور نہ کوئی ریلوے اسٹیشن قریب ہے اس مبارک مہینہ کو وصول کرنے میں مشغول ہوجاتے اور عید کی نماز پڑھ کر یہاں سے تشریف لے جاتے اس زمانے میں رائے پور کی خانقاہ کی کیا کیفیت ہوتی تھی اور شیخ وطالبین کا کیا حال ہوتا تھا[1] اس کا کچھ اندازہ راقم کی کتاب "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری" سے ہوسکتا ہے۔

رائے پور کے علاوہ بہٹ ہاؤس (سہارنپور) صوفی عبدالحمید صاحب (سابق وزیر پنجاب) کی کوٹھی واقع جیل روڈ (لاہور) گھوڑا گلی (کوہ مری پاکستان) اور جامعہ خالصہ کالج (لائل پور) میں بھی اس دھوم کے ساتھ رمضان گذرے کہ کئی کئی سو خدام اور اہل تعلق کا مجمع تھا، اور ذکر وتلاوت اور مجاہدہ کا زور شور۔

حضرت شیخ اور رمضان المبارک کا اہتمام وانصرام

اس سنت کا تسلسل واستمرار بلکہ اس کی ترقی وتوسیع اس شخصیت کے حصہ میں آئی جس کے ہاتھوں سے اپنے اسلاف ومشائخ اور اساتذہ ومربیوں کے بہت سے کارناموں کی حفاظت بہت سی تصنیفات کی اشاعت اور بہت سی ناتمام چیزوں کی تکمیل مقدر ہوچکی تھی[2] یوں تو رمضان کا اہتمام اس میں تلاوت وعبادت کا

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ[illegible] [2] ماخوذ از مقدمہ "صحبتے با اولیاء" تحریر کردہ راقم سطور (بالعہ نیت مولانا تقی الدین ندوی مظاہری)۔

انہماک انقطاع و یکسوئی اہلِ قلوب اور اہلِ معرفت کا ہر دور میں خصوصی شعار رہا ہے، لیکن شیخ کے یہاں اس بارے میں رمضان کی مشغولیت اور یکسوئی اور انقطاع کی جو کیفیت نظر آتی تھی، اس کے سمجھنے کے لئے ایک واقعہ جو لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے، مفید ہوگا۔

شیخ کے یہاں رمضان میں ملاقات تو ملاقات بات کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی اور چونکہ روزانہ ایک قرآن شریف ختم کرنے اور احتیاطاً کچھ زیادہ پڑھنے کا معمول تھا (کہ مبادا انتیس کا چاند ہو جائے)[1] تو یوں بھی تواضع اور خاطر داری میں گفتگو و ملاقات کی فرصت ملنی مشکل تھی، حکیم طیب صاحب رام پوری مرحوم کے حضرت شیخ سے خاندانی تعلقات و عزیز داری تھی، اور حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب سے تعلق کی بنا پر جو اس سلسلہ کے مشائخ میں تھے حضرت شیخ اور اس سلسلہ کے سب بزرگ ان کا خاص لحاظ کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ رمضان المبارک میں شیخ کے یہاں آگئے، جب بھی انھوں نے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا تو خدام نے کہا کہ یہ وقت حضرت شیخ کی مصروفیت کا ہے اس وقت بات کرنے کی فرصت نہیں، جب ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے شیخ سے کہا:۔

"بھائی جی! السلام علیکم، بات نہیں کرتا صرف ایک فقرہ کہوں گا، رمضان اللہ کے فضل سے ہمارے یہاں بھی آتا ہے، مگر یوں بخار کی طرح کبھی نہیں آتا، السلام علیکم جا رہا ہوں"[2]

---

[1] شیخ کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۳۳۸ھ کے ماہ مبارک میں ایک قرآن روزانہ پڑھنے کا معمول شروع ہوا جو تقریباً سنہ ۱۳۸۳ھ تک رہا، بلکہ اس کے بھی کچھ بعد تک (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی ج ۲ ص ۲۰۳-۲۰۶)

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی ج ۲ ص ۲۰۲

رمضان المبارک کا نظام الاوقات

رمضان المبارک میں شیخ کا نظام الاوقات بہت بدل جاتا، سرگرمی، جفاکشی، بلند ہمتی، ذوق عبادت وتلاوت اور یکسوئی وانقطاع اپنے نقطۂ عروج پر ہوتا۔

راقم السطور کو (۱۳۶۵ھ) میں ایک مرتبہ پورا رمضان ساتھ گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی، نظام الدین میں قیام تھا، اور شیخ کی خصوصی شفقت وتعلق کی وجہ سے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، پورے مہینہ کا اعتکاف تھا، روزانہ ایک قرآن شریف ختم کرنے کا التزام تھا، تھوڑے اضافہ کے ساتھ (تاکہ اگر ۲۹ کا چاند ہوجائے تو تیس قرآن مجید ختم کرنے کے معمول میں فرق نہ آئے) نظام الاوقات یہ رہتا تھا کہ افطار صرف ایک مدنی کھجور سے پھر ایک پیالی چائے اور ایک بیڑہ پان، نماز مغرب کے بعد اوابین شروع فرمادیتے جن میں کئی پارے پڑھتے، اوابین سے فراغت کے بعد اور عشاء کی نماز سے پیشتر ایک خصوصی مجلس ہوتی جس میں خاص عزیز وخدام شریک رہتے، عشاء اور تراویح کے بعد پھر مجلس ہوتی جس میں ہلکی سی افطاری مثلاً امرود یا کیلہ کا کچا ہوا یا کچھ پھلکیاں بڑے وغیرہ، لیکن قلیل مقدار میں کھانے کا اس وقت بھی ذکر نہیں، یہ گرمیوں کا زمانہ تھا، مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت ٹھہر ٹھہر کر قرآن مجید پڑھنے کے عادی تھے، اس لئے تراویح میں بہت دیر ہوجاتی، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مجلس میں بیٹھ کر حاضرین مجلس تو آرام کرنے چلے جاتے، شیخ نوافل میں مشغول ہوجاتے، سونے کا ایک منٹ کے لئے بھی معمول نہ تھا، اخیر وقت میں سحر کھاتے اور چوبیس گھنٹے میں یہی کھانے کا وقت تھا، نماز فجر اول وقت ہوجاتی، نماز کے بعد آرام فرماتے اور دن نکلنے کے بعد بیدار ہوتے، چوبیس گھنٹے میں یہی سونے کا وقت تھا، پھر ظہر تک قرآن مجید کا

دور رہتا یہی رمضان کا سب سے بڑا معمول تھا جو کچھ وقت ملتا قرآن مجید کی تلاوت اور دور میں گذرتا۔

رمضان کی اسی مشغولیت اور علو ہمت میں صحت کے تنزل کے باوجود اور ترقی ہی ہوتی چلی گئی ۱۳۹۵ھ کے رمضان کی تفصیل ایک خاص اور ہر وقت کے حاضر باش[1] اس طرح تحریر کرتے ہیں:۔

"وسط شعبان سے ۲۹ رمضان تک جو مہمان باہر سے آئے اور پورا رمضان یا کچھ ایام گذار کر واپس گئے ان کی ایک فہرست ایک خادم نے بطور خود مرتب کی تھی اس فہرست میں ۴۱۳ مہمانوں کے نام ہیں۔

حضرت شیخ کا نظام الاوقات رمضان شریف میں یہ رہا، سحری کے لئے جب لوگ بیدار ہوتے تو حضرت عموماً نوافل میں مشغول ہوتے اور جب سحری کا وقت ختم ہونے لگتا تو ایک دو لقمے نوش فرماتے اور چائے کی ایک پیالی، پھر جماعت تک تکیہ لگائے لوگوں کی طرف متوجہ رہتے، مہمان حضرات آتے سامنے ہوتے، بعد نماز فجر آرام فرماتے، تقریباً ۹ بجے دن تک، پھر ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول ہو جاتے، دوپہر زوال کے قریب تک، پھر ڈاک ملاحظہ فرماتے اور بعض ضروری خط لکھواتے، اذان ظہر تک، پھر نماز میں مشغول ہوتے بعد ظہر تلاوت شروع فرماتے مسلسل عصر تک، مہمانوں کو ہدایت تھی کہ سب لوگ ہمہ تن ذکر میں مشغول ہو جائیں قبیل عصر تک، چنانچہ ذاکرین ذکر میں مشغول ہوتے اور دوسرے حضرات تلاوت میں مشغول رہتے عصر تک،

---

[1] مولانا مسعود حسین صاحب بہاری مظاہری خلیفہ مجاز حضرت شیخؒ

بعد عصر حضرت قرآن شریف سناتے اکثر مہمان یا تو قرآن شریف سنتے یا خود تلاوت کرتے قبیل افطار تک حضرت چند منٹ پہلے تلاوت موقوف کر کے مراقب ہو جاتے مہمانوں کو ہدایت تھی کہ صحن مسجد میں افطاری کے دسترخوان پر چلے جائیں، اور حضرت اکیلے پردہ میں ہو جاتے اذان پر ہدی کھجور سے افطار، اور اس پر زمزم ایک پیالی نوش فرماتے پھر مراقب ہو جاتے، ٹیک لگا کر بیٹھے، نماز مغرب سے فراغت کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا، اور حضرت دیر تک نوافل میں مشغول رہتے اذان کے آدھ گھنٹہ پہلے تک، اس وقت ایک دو انڈے نوش فرماتے اور ایک پیالی چائے، یہ چائے بھی ہفتہ عشرہ کے بعد بہت اصرار پر شروع ہوئی، اس طرح انڈا بھی سخت اصرار پر منظور فرمایا تھا، روٹی چاول وغیرہ کی قسم سے کوئی چیز بھی رمضان بھر بلکہ ایک دن پہلے بھی نوش نہیں فرمایا۔

اذان عشاء سے آدھ گھنٹہ پہلے پردہ ہٹایا جاتا، حضرت ٹیک لگا کر مہمانوں کی طرف متوجہ رہتے، عجیب منظر ہوتا، نئے آنے والے ملتے، پھر اذان ہو جانے پر ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل پھر فرض و تراویح میں مشغول ہو جاتے اس رمضان میں تین قسم کی سماعت فرمائی پہلے مفتی یحییٰ صاحب نے سنایا، پھر حافظ فرقان صاحب نے، پھر میاں سلمان سلمہ اور مفتی یحییٰ صاحب نے۔ پورا ماہ اعتکاف میں گزرا، اور اکثر و بیشتر مہمان بھی معتکف رہے حتیٰ کہ بسا اوقات ڈاکخانہ بھیجنے کے لئے کسی آدمی کا ملنا مشکل ہو گیا تھا، بس حضرت کے خیمہ کے چار خادم کو خاص کر کے ضروریات کے لئے غیر معتکف

دیکھا گیا۔

آخر عشرہ میں یا اس سے کچھ پہلے بعض بعض دوستوں کے بار بار مٹھائی یا کباب لانے کی بنا پر تراویح کے بعد ایک دو لقمہ مٹھائی یا شامی کباب بھی نوش فرما لیتے، مگر اکثر تو تقسیم ہی کرا دیتے اوائل رمضان میں اعلان کرا دیا گیا تھا یعنی حضرت نے خود فرما دیا تھا کہ تراویح کے بعد کتاب ہوا کرے گی چنانچہ کتاب ہی سنانے کا معمول رہا، اور اس وقت چنے یا پھلکی وغیرہ کا جو معمول پہلے سے چلا آرہا تھا، اس رمضان میں بند کروا دیا گیا تھا کہ وقت ضائع ہوگا، کتاب وغیرہ سے فراغت کے بعد فرماتے حضرات جاؤ وقت کی قدر کرو، چنانچہ اکثر تلاوت یا نماز میں لگ جاتے اور حضرت بھی مشغول ہو جاتے، کچھ دیر کے بعد کچھ دیر کے لئے آرام فرماتے مگر تمام یعنی ولا ینام قلبی کی طرح کیفیت رہتی کہ ابوالحسن چلے سے جو پاس ہی کو ہوتے کبھی کوئی بات فرما بھی دیتے، اور یہ فرماتے کہ تم لوگوں کی تلاوت اور ذکر سے میرے آرام میں فرق نہیں آتا۔

اگلے رمضان (رمضان ۱۳۸۳ھ) کا انتظام تقریباً وہی کا رہا، کچھ چیزوں میں تبدیلی تھی، مولانا مسعود حسین صاحب بہاری[1] نے اپنے مکتوب میں جو حالات لکھے ہیں اس کی چند اہم باتیں یہ ہیں:—

* ۲۹ر شعبان کو فجر کی نماز سے پہلے ہی مہمانوں اور معتکفوں نے اپنی اپنی جگہوں پر قبضہ کرنا، اور بستر ے پھیلانے شروع کر دیئے، چنانچہ بعد فجر جو لوگ گئے

---

[1] مولانا مسعود حسین بہاری، شاہ ہری کا تقاضہ طور پر رمضان المبارک کے انتظام و اہتمام کے ذمہ دار رہا اور منتظمین میں ہوا کرتے تھے۔

ذاکروں کو تیسری صف میں جگہ ملی، حضرت پہلے ہی اعلان فرما چکے تھے کہ
۲۹ شعبان کو بعد عصر مسجد ہی سے اعتکاف گاہ منتقل ہو جائیں گے چنانچہ
تشریف لے گئے، اور روزے سے اوپر تین سو سے زائد کہا جاتا ہے — جو
دار الطلبہ جدید میں اقامت و اعتکاف کی نیت سے پہنچ گئے، حالانکہ
مسجد بہت وسیع اور اندر پچاس صفوں کی جگہ ہے، مگر مہمانوں اور سالکین سے مسجد
بھر گئی چنانچہ جو مہمان رات کو یا صبح سے پہلے یا بعد پہنچے ان کو مسجد کے برآمدے
میں جگہ دلوائی گئی، شام کے دسترخوان میں تقریباً سو سے کم اور سحری کے وقت سو سے
زائد مہمان ہو گئے تھے، پھر مہمان آتے گئے، اور برآمدہ مسجد کے پُر ہو جانے پر
اندرون مسجد جگہ جا بجا دلوائی گئی، اور ہر مہمان کو تقریباً ڈیڑھ فٹ کی جگہ اخیر
کے دو عشروں میں میسر رہی، مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے دوسرے عشرہ کے
وسط میں ایک عظیم الشان خیمہ نصب کرا دیا گیا یعنی مسجد کے کھلے صحن میں وہ بھی
اخیر عشرہ میں پُر ہو گیا، پہلے ہی سے دار الطلبہ جدید کے چھ کمروں کو خالی کرا لیا گیا
تھا، چنانچہ پہلے دوسرے عشروں میں تو صرف مستورات کو ان کمروں میں جا بجا
ٹھہرایا جاتا تھا، مگر اخیر عشرہ میں دو کمرے تو مستورات کے لئے رہے باقی چار کمروں
میں پیال ڈلوا کر عام مہمانوں کو ٹھہرایا گیا، بعد کو سبھی کمروں میں پیال پڑ گئے، ۲۳
سے ۲۹ تک تقریباً پونے تین سو مہمان دسترخوان پر کھانا کھاتے رہے، مزید
مولوی نصیر الدین صاحب کے پاس کھاتے رہے....... اس سال تبلیغی
جماعتیں طلباء اور مدرسین اور اہل علم کثرت سے آئے، حضرت نے متعدد
اشخاص کو اجازت دی، گجرات، بمبئی، پالن پور کے مہمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔

اختتام پر تقریباً بارہ بجے شب کو پردہ گرا دیا جاتا تھا۔ اس سال گھر والوں اور دوستوں
کے اصرار پر ناشتہ عصر اور اس بنا پر کہ بالکل فاقہ رہنے پر بواسیر کا غلبہ ہوتا تھا اور
بادی چیزیں بعد میں رطوبت بہت بڑھ گئی تھی کہ جس کے نتیجہ میں رمضان کے بعد بھی
کچھ عرصہ تک کچھ کھایا نہیں جاتا تھا افطار ہی کا سلسلہ شروع کیا گیا حضرت کچھ تفکر
فرما لیتے اور پھر نیک مخصوص مجلس ہوتی ہماری رحمانی مراقبے کی کیفیت رہتی ایک بجے
کے بعد سو جاتے ڈھائی بجے اٹھتے ضروریات سے فارغ ہوکر نوافل میں مشغول ہوجاتے
صبح صادق سے آدھ گھنٹہ پہلے دودھ یا پان کے چند چمچے نوش فرما کر ایک پیالی چائے
نوش فرماتے پھر نوافل میں مشغول ہوجاتے یہاں تک کہ اذان ہوجاتی۔"

۱۳۹۵ھ کے رمضان کا نظام الاوقات جو خود شیخ نے آپ بیتی میں لکھا ہے
حسب ذیل ہے:۔

"ما بعد مغرب اوابین میں دو پارے کے بعد چائے و استنجا وغیرہ بعد ۸ مجلس
اس کے بعد ۹ بجے عشاء بیعت و گفتگو ۹ بجے ۱۰ بجے بعدہ ختم یٰسین
و دعا بعدہ قضاء کی، رمضان ۱۰ بجے تا ۱۱ سو جاتا، بعدہ اوراد کی سماع قرآن
کے بعد ۱ بجے کھانا بند سو بجے ۲ بجے کھانا کیا اور سحر کا انتظام ہو
تہجد میں دو پارے بعد نماز فجر آرام تا ۱۰ بجے بعدہ قرآن شریف دو پارہ
دیکھ کر تا ۱۲ استغراقات تا ایک بجے بعد ظہر ختم خواجگان اور ذکر دو پارے سنانے کا
معمول بعد عصر ارشاد و احوال۔"[1]

۱۳۸۹ھ سے شیخ نے دار الطلبہ جدید کی مسجد میں رمضان گزارنا شروع کیا۔

---

[1] آپ بیتی ص ۱۴۰-۱۴۱

بہرحال مجمع بڑھتا چلا گیا، ۱۳۸۵ھ میں چالیس نفر معتکف تھے، اخیر میں دو سو تک تعداد پہونچ گئی، ۱۳۸۶ھ میں دو سو سے معتکفین کی تعداد شروع ہوئی، ۱۳۸۷ھ میں خیمے لگانے پڑے، طلبہ کے جو حجرے خالی تھے ان میں مہمانوں کو ٹھہرایا گیا[1]، ۱۳۹۰ھ کا رمضان سہارنپور میں گزرا، دارالطلبہ جدید کی مسجد دو منزلہ ہو گئی تھی مگر وہ بھی معتکفین کے لئے کافی نہ ہوئی، مہمانوں کے لئے دارالطلبہ کے حجرے خالی کرائے گئے، شروع رمضان میں ۸-۹ سو کا اندازہ تھا، اخیر رمضان میں مولوی نصیر الدین صاحب نے بتایا کہ آج افطار پر مہمان ہیں، عشرہ اولیٰ کے ختم ہی پر مہمان ایک ہزار تک پہونچ گئے تھے، ۲۷-۲۸ رمضان تک تعداد دو ہزار تک پہونچ گئی۔[2]

نظام الاوقات یہ تھا، ۱۱ بجے تقریباً ایک گھنٹہ وعظ، ظہر کے بعد عصر تک ختم خواجگان اور ذکر بالجہر، عصر کے بعد اکمال الشیم اور ارشاد الملوک، مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ نوافل اور طعام، اس کے بعد عشاء کی اذان تک نو وارد آنے والوں کو متعلقین سے ملاقات، عید کے بعد بھی دار جدید کی مسجد میں کئی دن قیام کرنا پڑا، اس لئے کہ مجمع بہت زیادہ تھا، شیخ نے ۷ شوال ۱۳۹۲ھ کے بارے میں لکھا ہے کہ آج کے رخصتی مصافحوں سے سمجھا تھا کہ مہمان تھوڑے ہی رہ گئے ہوں گے مگر ابھی تو آج اور کل کے ٹھہرنے والے بھی پانچ سو کے قریب ہیں۔[3]

سہارنپور کے رمضان کے زمانہ میں اگرچہ متعلقین پورے انہماک و یکسوئی کے ساتھ (الا ماشاء اللہ) تلاوت و نوافل اور رمضان کے خصوصی معمولات میں منہمک رہتے شیخ بار بار فرماتے جتنا جی چاہے ساتھی سوئیں اور کھائیں لیکن باتیں نہ کریں کہ سب

---

[1] آپ بیتی ۷ صفحہ ۲۲ [2] ایضاً [3] ایضاً صفحہ ۱

زیادہ مضر ہی ہے، لیکن شیخ کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ رمضان کے اوقات پوری طرح وصول کئے جا رہے ہیں یا اس میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی شیخ اس کو از راہِ تواضع و احتسابِ نفس حیلے سے تعبیر فرماتے، ۲۸؍ فروری ۱۹۸۲ء کے ایک مکتوب میں جو راقم سطور کے نام ہے تحریر فرماتے ہیں:

"اپنے بیان کے ہجوم کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ میں کئی سال سے
مولوی منور، مفتی محمود وغیرہ خصوصی احباب سے بار بار یہ سوال کرتا تھا کہ
اس بندے کو رمضان میں بیان کرنے سے فائدہ زیادہ ہے یا نقصان؟"

ایک پُراثر حسبِ حال نظم

اس موقع پر مناسب ہوگا کہ عزیزی مولوی محمد ثانی مرحوم کی وہ نظم درج کر دی جائے جس میں رمضان المبارک کو وداع کہنے کے سلسلہ میں اس تاریخی موقع، اس پرکیف منظر اور اس کے ایک تاریخی یادگار بن جانے کی طرف لطیف اشارات کئے گئے ہیں، یہ نظم جب مولوی معین الدین صاحب نے بلند آواز سے پڑھی تو ایک سماں بندھ گیا، خود شیخ پر بڑا اثر معلوم ہوتا تھا، خاص طور پر آخری دو شعروں پر بہت سی آنکھیں اشکبار اور پڑھنے والے کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

وداعِ رمضان

رحمتِ حق آئی قسمت ور چلے — سجدہ ریزی کو خدا کے گھر چلے
نعمتوں سے گود بھر کے خوش نصیب — زاہدانِ باصفا بڑھ کر چلے

وا ہوئے در بزمِ رحمت کے تمام | اہلِ درد و سوز کھنچ کھنچ کر چلے
گلشنِ رحمت کی ہر دم سیر کی | اپنے دامن کو گلوں سے بھر چلے
رہ گئے محروم ہم ہی کم نصیب | جھاڑ کر دامن کو اپنے گھر چلے
شمع کی مانند اس کی بزم میں | چشمِ تر آئے تھے دامن تر چلے
قدر نعمت کی نہ کچھ ہم کر سکے | بوجھ عصیاں کا لئے سر پر چلے
ہائے رے حسرت نصیب و وائے غم | کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے
نور سا چاندنی جیسی پڑی | سر چھپانے کو مہ و اختر چلے
ابرِ رحمت کے شب و روز و سحر | ہر طرف تم نور برسا کر چلے
تم سے ملتی تھی دلوں کو تازگی | تم چلے ارمان سارے مر چلے
الفراق اے ماہِ رمضاں الفراق | زخمِ دل پر کیا لگے نشتر چلے
آئیے رحمت کو لئے ہر سال تو | تیری رحمت کی ہوا گھر گھر چلے
ایک جھونکا تیری رحمت کا ادھر | بہرِ الطاف اے کرم گستر چلے
ہوں نہ ہوں یہ لطف کے دن پھر نصیب | اور دورِ بادۂ کوثر چلے
اور بھی کچھ اور بھی کچھ اور بھی | جانے کب دورِ سبو ساقی کر چلے

ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

باب ششم

مدینہ طیبہ کا مستقل قیام، طیبہ کے لیل و نہار، ہندوستان کے چند سفر اور رمضان المبارک

آخری سفرِ حجاز اور مستقل قیام

حضرت شیخ کی مدۃ العمر کی تمنا تھی کہ مدینہ طیبہ جا کر رختِ سفر کھول دیں، اور جن کا سنت و شریعت اور حدیث کی ساری عمر خدمت کی اور ان کے دامن سے وابستہ رہے، انھیں کے قدموں میں بقیہ زندگی گذار دیں، ان کے محبوب شیخ و مرشد (مولانا خلیل احمد صاحبؒ) کی بھی یہی آرزو و کوشش تھی، اللہ نے ان کو کامیاب کیا، اب جبکہ ضعف بصارت اور مختلف قسم کی معذوریوں کی وجہ سے درس و تدریس اور براہ راست مطالعہ و تصنیف کا موقع بھی نہیں رہا تھا، اس تمنا میں مزید شدت و قوت پیدا ہو گئی، بالآخر ۵ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ (۲۳ اپریل ۱۹۷۳ء) کو اس نیت سے حجاز کے لئے روانہ ہو گئے کہ بقول اقبالؒ

بیا پیری رہ یثرب گرفتم — نوا خواں از سرور عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

یہ وہی سفر تھا جس کے بعد مستقل قیام ہوا، اور شیخ نے ہجرت کی نیت فرمائی[1]

---

[1] آپ بیتی نمبر ۶

شیخ پہلے اقدام عالیہ میں حاضر رہتے لیکن اس مرتبہ پاؤں کی معذوری کی وجہ سے مشرقی دیوار کے برابر باب جبرئیل سے ملحق جو چبوترہ ہے اس کو مستقر بنایا۔

مدینہ کا نظام الاوقات

مدینہ کے قیام میں صبح کی نماز کے بعد مجلس ذکر ہوتی، پھر شیخ تھوڑی دیر آرام فرماتے اور رفقاء ناشتہ کرتے، بیدار ہونے کے بعد شیخ اور تصنیفی مشاغل رہتے، یا ڈاک لکھوائی جاتی، ظہر، عصر، مغرب، عشاء سب مسجد شریف میں ادا ہوتی، عصر کے بعد مدرسہ علوم شرعیہ کے صحن میں عام مجلس ہوتی جس میں اکثر کوئی کتاب پڑھی جاتی، اس دوران خاص زائرین اور ممتاز علماء جو ملاقات کے لئے آتے ان سے تعارف وملاقات ہوتی، عشاء کے بعد عام دسترخوان بچھتا، سہارنپور کے برخلاف جہاں دوپہر کا کھانا اصل تھا جس میں شیخ بڑے اہتمام سے شرکت فرماتے اور رات کا کھانا برائے نام ہوتا جس میں شیخ کی شرکت ضروری نہ تھی، یہاں مدینہ طیبہ کے قیام میں اصل کھانا رات کا تھا، جس میں کسی عزیز مہمان کی غیر حاضری حضرت شیخ کو بہت محسوس ہوتی، راقم سطور کو اس سے بہت واسطہ پڑ چکا ہے، اس لئے وہ بالعموم مدینہ طیبہ میں کسی دوسری جگہ رات کی دعوت قبول نہ کرتا، اس وقت حضرت شیخ کی طبیعت مبارک پورے نشاط وانبساط پر ہوتی، عزیز مہمانوں کی خاطر داری اور ان کی نگہداشت اسی طرح ہوتی جیسی دوپہر کے دسترخوان پر سہارنپور میں مہمانوں کے کھانے کا انتظام تھا، وہ صوفی محمد اقبال صاحب[1]

---

[1] صوفی محمد اقبال ہوشیارپوری ان خوش قسمت اور ذی نصیب لوگوں میں ہیں جن پر حضرت شیخ کی نظر خاص رہی اور انھوں نے بھی سعادت وخدمت کا بڑا حصہ پایا اور اعتماد و اختصاص اور اجازت خاص سے سرفراز ہوئے اور اخیر وقت تک جوار رسول اور اپنے شیخ کے دامن عاطفت میں رہے۔ شیخ کے ملفوظات وافادات اور حالات ومبشرات پر ان کے متعدد رسالے ہیں جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

کے ذمہ ہوتا۔ ڈاکٹر اسماعیل ؒ مرحوم اور دوسرے خدام اہل تعلق بھی اس میں پیش پیش رہتے
مسجد نور میں (جو مدینہ پاک کا تبلیغی مرکز ہے) اہم اجتماعات میں شرکت فرماتے، اور بقیع کی
زیارت کو بھی جاتے۔

حجاز کے مخصوص محبین وخدام

حجاز سے اس روحانی یا قلبی تعلق کے ماسوا (جس کا ہم آپ اور ہر کسی کو تعلق ہے)
شیخ اور ان کے خاندان کا اس پاک و مقدس سرزمین سے ایک طرح کا وطنی اور عزیزانہ تعلق
تھا، اور وہ ان کے لئے وطن ثانی کی حیثیت رکھتی تھی کہ مکہ معظمہ میں مولانا محمد سعید صاحب کیرانوی
ناظم اول مدرسہ صولتیہ کا خاندان تھا جس سے برادری اور عزیزداری کے تعلقات تھے۔ مولانا
محمد سلیم صاحب مرحوم ناظم مدرسہ صولتیہ ایک عزیز اور معزز فرد خاندان تھے اور مدرسہ صولتیہ
کے دیوان میں (جہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے قیام کی ایک بڑی مدت
گذری تھی) عرصہ تک شیخ کا بھی قیام رہا۔ مولانا محمد سلیم صاحب کے صاحبزادہ مولوی مسعود صاحب
(حال ناظم مدرسہ صولتیہ) اور مولانا کے برادرزادہ الحاج محمد سعید رحمۃ اللہ (معروف بہ ندوی)
خاندان کے بچوں کی طرح تھے۔ حکیم محمد یامین صاحب جو عرصہ سے مدرسہ میں مقیم ہیں، وہ مکہ کے مہاجر
ہیں یا رشتہ کے ماموں ہوتے تھے۔ یہاں مدرسہ میں پہونچ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سہارنپور
سے کاندھلہ یا دلی چلے گئے۔

ڈاکٹر اسماعیل مرحوم حضرت کے مخلص خادم، اور بس یوں خاص ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت
شیخ کی خدمت کے لئے دوسرے تعلقات کے تمام اور تعلق ذریعہ معاش کے گویا حضرت شیخ کی خدمت کے لئے
فارغ رکھا تھا۔ حضرت شیخ کے خاص مزاج، ان اور صحت کی ترتیب، زراعت سے بخوبی وہ واقف تھے۔

یہیں کہ معظمہ میں حضرت کے خادم خاص اور مجاز باختصاص ملک مولوی عبدالحفیظ کا بھی گھر تھا جن کو اپنی فطری سعادت مندی، اطاعت شعاری اور مزاج شناسی کی وجہ سے حضرت کے یہاں وہ مقام حاصل تھا جو کم ارادت مندوں کو حاصل ہو سکا، حضرت کی عربی تصنیفات خصوصاً "اوجز المسالک" اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی شہرۂ آفاق شرح ابوداؤد "بذل المجہود" اور دوسرے عربی رسائل کی طباعت کے اہتمام اور ان کی اشاعت کے لئے مکہ معظمہ میں مستقل مکتبہ باب العمرہ پر مکتبہ امدادیہ کے نام سے اور طباعت کے لئے مدینہ طیبہ میں مستقل مطبع مطابع الرشید کے نام سے قائم کرنے کی وجہ سے ان کو حضرت کی ایسی مسرت و ابتہاج اور ایسی دلی دعائیں حاصل ہوئیں جو بڑے مجاہدوں اور ایثار و قربانی کے بعد یاران باختصاص کو حاصل ہوتی ہیں، افریقہ اور ہندوستان کے سفر میں (جن کا ذکر آئندہ باب میں آرہا ہے) وہ حضرت کے رفیق خاص، خاص موقعوں پر دعا کرانے والے، جمعہ کے امام و خطیب اور حضرت کے ترجمان رہتے، ان کے والد محترم ملک عبدالحق صاحب عرصہ سے مکہ معظمہ ہجرت کر کے آگئے تھے اور یہاں انھوں نے کارخانہ قائم کر لیا تھا، ان کے سب صاحبزادے خدمت کے لئے اور ان کی گاڑیاں اور وسائل حضرت کی راحت کے لئے وقف تھے۔

حضرت کے بعد کی مکہ معظمہ میں قیام گاہ بھائی سعدی کا وسیع و شاندار محل تھا، جس کے قریب ہی متعدد ہندوستانی و پاکستانی اہل تعلق آباد ہیں جن میں ہمارے عزیز خاص مولوی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جہاں سالہا سال سے اس عاجز کے رفقاء اور اعزہ کا قیام رہتا ہے اور وہ بھی حضرت سے نیازمندانہ اور خادمانہ تعلق رکھتے ہیں، حضرت کی بھی ان کے پورے گھر پر شفقت تھی، ان کا گھر بھی بھائی سعدی کے

گھر سے چند گز کے فاصلہ پر ہے، متصل ہی محلہ کی مسجد ہے جس کو بھائی سعدی نے خاص
توجہ و اہتمام سے وسیع و مکمل کیا ہے، اسی نسبت سے وہ "مسجد الرحمت" کے نام سے
مشہور ہے، یہاں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر حفائر کا محلہ ہے جہاں تبلیغی جماعت کا
خاص مرکز، مسجد اور مہمان خانہ ہے، اور وہ ہندوستانی پاکستانی رفقاء جماعت کی خاص
فرودگاہ ہے۔

جہاں تک مدینہ طیبہ کا تعلق ہے وہاں سے حضرت شیخؒ کا تعلق اور بھی گہرا ہے
یہاں اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ساتھ شیخ نے مہینوں قیام
کیا ہے اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے برادر بزرگ مولانا سید احمد صاحب
فیض آبادی کی شفقتوں اور میزبانیوں کا لطف اٹھایا ہے، جو سالہا سال تک وہیں
ان کے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحب کے رفیق خاص اور شریک دسترخوان رہے ہیں، مولانا
سید احمد فیض آبادی کے بعد ان کے اور مولانا مدنی کے برادر خورد مولانا سید محمود احمد صاحب
سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں کی وجہ سے مدرسہ علوم شرعیہ شیخ کی مستقل قیام گاہ
بن گیا، مولانا سید محمود صاحب کو شیخ سے اتنا تعلق اور محبت تھی کہ اپنے باغ کے آم بڑے
اہتمام سے ان کے لئے ہندوستان بھیجنے کا انتظام کرتے، اگر وہ نہیں پہونچ سکتے تھے
تو ان کا شیرہ ہی نکال کر بھیج دیتے، حضرت شیخ نے بھی ان تعلقات کا ایسا پاس کیا کہ
ان کی وفات کے بعد ان کا رسالہ [illegible] اہتمام سے شائع کیا
اور میں ناچیز سے اس پر مقدمہ اور تعارف لکھوایا، مولانا سید محمود صاحب کی وفات
کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا سید حبیب (حال مدیر اوقاف) نے جو امیر مدینہ کے
[illegible] مدینہ طیبہ کے [illegible]

کے ساتھ مدرسہ شرعیہ میں قیام کی سہولتیں مہیا کیں۔

مدینہ طیبہ کے قیام میں شیخ کے سفروں کی تنظیم ان کو طے کرانے اور ان کے لئے ہر طرح کے انتظامات کرنے نیز قیام کے دوران بھی ضبط و نظم قائم کرنے میں قاضی عبدالقادر صاحب کا خاص حصہ رہتا تھا جو محض شیخ کی خدمت اور انتظام کے لئے اپنے وطن جھاوریاں پاکستان سے آکر پورے پورے ماہ قیام کرتے اور حضرت ان ہی کی تبلیغی اجتماعات کے لئے عارضی طور پر چلے جاتے اسی طرح حجاز کی جماعت تبلیغ کے امیر مولانا محمد سعید خان بھی خادمانہ اور مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور مسجد نور کے قیام کے علاوہ بھی جوان کی خاص قیام گاہ ہے اپنے کو ایک طرح کا میزبان اور ذمہ دار سمجھتے اسی طرح مدینہ طیبہ کے خاص اہل تعلق اور حاضر باشوں میں حاجی نجیب احمد صاحب (فرزند خان بہادر حاجی شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی) مولانا آفتاب عالم صاحب (فرزند مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی) عزیز گرامی سید حسن عسکری طارق، قاری عباس صاحب بخاری وغیرہ تھے، طارق صاحب کو حضرت شیخ کی خصوصی شفقت اور قرب حاصل تھا۔[1]

افسوس ہے کہ ممالک عربیہ ہی نہیں پوری نئی نسل کے ذوق و نقطۂ نظر کے بدل جانے اور تصوف کے خلاف مختلف جماعتوں کی طرف سے غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کر دینے کی وجہ سے عرب فضلاء جامعات و کلیات کے نوجوان طلبہ اور باہر کے

---

[1] مدینہ طیبہ کے خصوصی خدام میں مولوی عبدالقدیر حیدرآبادی، مولوی حبیب اللہ، مولوی نجیب اللہ، مولوی اسماعیل بدات اور حکیم عبدالقدوس صاحب افراد خاندان اور بچوں میں مولوی شاہد اور حافظ جعفر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آنے والے عرب حجاج و زائرین نے اس زریں موقعہ سے بہت کم فائدہ اٹھایا کہ ایک متبع سنت محدث جلیل، عالم ربانی اور قوی النسبت شیخ مسجد نبوی کے زیر سایہ اور صاحب مسجد کے زیر قدم خدمت و تربیت کے لئے سب کشتیاں جلا کر مستقل پڑا ہوا ہے کبھی کبھی جب باہر کے کسی عالم سے اس جلیل القدر شخصیت کے تعارف کی نوبت آتی تو وہ ملاقات کا اشتیاق ظاہر کرتے اور حاضری دیتے ان میں ناچیز کو ان دو تین حضرات کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوا استاذ اکبر شیخ عبدالحلیم محمود شیخ الجامع الأزہر استاذ محمد المبارک سابق عمید کلیۃ الشریعۃ دمشق و سابق وزیر شام، علامہ الحبیب بلخوجہ محدث و مفتی تونس اور بھی کچھ ممتاز علماء عرب ہوں گے جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس استشاری اور مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لئے آتے تھے اور راقم سطور کو رکنیت کی وجہ سے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقعہ ملتا تھا۔

حضرت شیخ کی قانونی کفالت (ٹکٹ کا بھیجنا وغیرہ امور مستقلاً الحاج محمد سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ سعدی صاحب) کے ذمہ رہتا تھا، اس مرتبہ شیخ کے آنے کے بعد سے ویزہ میں توسیع کی خاص کوشش کی اور شیخ محمد صالح القزاز امین عام رابطہ عالم اسلامی کے ذریعہ سلسلہ جنبانی شروع کی، مکہ کے مشہور عالم سید محمد علوی مالکی نے بھی اس کوشش میں حصہ لیا، یہ کوششیں جاری تھیں کہ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ (۲۷ جون ۷۳ء) کو اچانک اطلاع ملی کہ اقامہ بن گیا، لوگوں نے اس پر بڑا تعجب کیا کہ یہاں دس دس، پندرہ پندرہ برس سے لوگ پڑے ہوئے ہیں مگر اب تک باوجود بڑوں بڑوں کی سفارش کے نہیں بنا، یہ بھی خبر تھی کہ شیخ کا اقامہ براہ راست ملک فیصل نے بغیر مجلس کے

خود ہی منظور کرکے بھیج دیا، بہرحال اس میں شیخ صالح قزاز اور شیخ محمد علوی کی مساعی جمیلہ
کو دخل ہے اقامہ توضابطہ کی کارروائیوں کے بعد بہت تاخیر سے ملا جس کی ابتداء
۲۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۹۳ھ سے ہوئی ۱۰ر اگست ۱۹۷۳ء کو شیخ پاکستان کے ارادہ سے
جہاں رائے ونڈ کا تبلیغی اجتماع ہونے والا تھا، مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوئے مگر یہ سفر
نہیں ہوسکا، اس عرصہ میں رمضان شروع ہوگیا، شیخ مولانا محمد سلیم صاحب کے یہاں کھانے
سے فراغت کے بعد سیدھے تنعیم جاتے وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کر طواف وسعی سے
فارغ ہوکر بھائی سعدی کے یہاں جاتے، وہیں آرام فرماتے، بقیہ رمضان کی تراویح
پڑھ کر شیخ مدینہ کے لئے روانہ ہوئے کہ جو رمضان حجاز میں ہوتا تھا، اس کا نصف اول
مکہ میں عمروں کے شوق میں اور نصف آخر مدینہ پاک میں مسجد نبوی میں اعتکاف کی طلب میں
گذرتا تھا، اس مرتبہ شیخ کا معتکف باب سعود سے ذرا آگے چل کر تھا، چھبیسویں رمضان کی
شب میں اسرائیلی جنگ کی بڑی سخت خبریں سننے میں آئیں، اس کے لئے ختم بخاری کا اہتمام
کیا گیا، رات کے ریڈیو پر جنگ کے بند ہونے کا اعلان ہوگیا۔

ہندوستان و پاکستان کے سفر

رمضان کے بعد سے شدت سے بخار کا سلسلہ شروع ہوا، اس کی وجہ سے اس سال
حج میں شرکت نہ ہوسکی، اس سال مولانا انعام الحسن صاحب نے اپنے رفقاء کے ساتھ حج کیا۔

اب اقامہ کی وجہ سے شیخ کا حجاز کا قیام اصلی تھا اور دوسری جگہ کا عارضی کہ
چھ ماہ سے زیادہ صاحب اقامہ کو باہر رہنے کی اجازت نہیں ان میں اقامہ منسوخ ہو جاتا ہے،
مولوی ہارون مرحوم کے انتقال کی وجہ سے اور بعض دوسرے مسائل وضروریات کی بنا پر
اہل تعلق کا تقاضہ تھا کہ حضرت شیخ ہندوستان تشریف لائیں، بعض اہل تعلق کا مشورہ تھا

۱؎ شیخ نے اپنی آپ بیتی میں اس سلسلہ میں عالم صاحب اور مولانا انعام صاحب کا نام لیا ہے۔

کہ اگر ہندوستان تشریف لائیں تو پھر رمضان سہارنپور میں گذرنا چاہئے تاکہ اس قیام سے اجتماعی اور درود ورس فائدہ اٹھایا جا سکے، پاکستانی احباب کی مساعی سے اس مرتبہ پاکستان کا ویزہ مل گیا اس بنا پر ۳ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۰ھ (۲۴ مئی سنہ ۷۰ء) کو مدینہ پاک سے مکہ کے لئے روانگی ہوئی، راقم سطور بھی ساتھ تھا، بعد مغرب روانگی ہوئی، اور شب ڈاکٹر اسماعیل صاحب (جو اس زمانہ میں بدر کے ڈاکٹر تھے) کی درخواست پر تقریباً بیس گھنٹے بدر میں قیام رہا، شب کو مسجد عریش کے میدان میں سوئے، بعد عصر بدر سے روانگی ہوئی، اور شب میں مدرسہ صولتیہ پہونچے۔

۲۲ جون سنہ ۷۰ء کو صبح جدہ سے کراچی کے لئے روانہ ہوئے اور ۳ بجکر ۲۰ منٹ پر کراچی پہونچ گئے، وہاں مجمع بہت تھا ڈھائی تین ہزار کا اندازہ ہے، ظہر کی نماز کی مسجد میں پڑھی، کراچی میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے مدرسہ اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کے مدرسہ بھی جانا ہوا، اسی قیام میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی سے ملاقات ہوئی، جمعہ کو رائے ونڈ کے لئے روانگی ہوئی جہاں مشتاقین کا بڑا ہجوم تھا، رائے ونڈ سے ڈھڈیاں جانا ہوا، وہاں بھی بڑا ہجوم تھا، چونکہ دہلی کے ٹکٹ کراچی سے تھے اس لئے کراچی جانا پڑا، ۱۳ جولائی کو کراچی سے دہلی پہونچنا ہوا، اور ایک دن دہلی قیام کے بعد شنبہ ۲۰ جولائی کو سہارنپور پہونچ گئے، مشتاقان دید دور دور سے سفر کر کے زیارت کے لئے آتے رہے۔

اس قیام ہندوستان میں ایک سفر میوات کا بھی ہوا اور اگست کے تبلیغی اجتماع سہارنپور میں بھی شرکت ہوئی۔

اس سال (سنہ ۹۰ھ) کا رمضان اسی دھوم دھام کے ساتھ دار جدید کی مسجد

میں ہوا، لوگوں کا شروع سے اندازہ تھا کہ اس سال مجمع بہت ہوگا، چنانچہ ایسے ہی ہوا
شروع رمضان میں آٹھ سو کا اندازہ تھا اور آخر رمضان میں اٹھارہ سو تک پہونچ گیا
تراویح میں تین پارے روزانہ سننے کا معمول تھا تاکہ ہر عشرہ میں ایک قرآن ہو سکے، اس سال
مولوی خالد برادر خورد مولوی سلمان صاحب نے قرآن شریف سنایا، راقم سطور کی بھی
معمول کے مطابق دو دن کے لئے حاضری ہوئی، میری حاضری پر حضرت کا بعد تراویح
افطاری کا معمول بہت اہتمام سے ہونے لگتا۔

رمضان میں بھی شیخ کی طبیعت کچھ خراب رہی اور امراض بڑھتے ہی چلے گئے۔

۱۵ ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ (۳۰ نومبر ۱۹۷۳ء) کو سہارنپور سے سفر حجاز کی روانگی شروع
ہوئی، ہجوم اتنا تھا کہ پیچھے گھر سے دارالطلبہ تک آدمی ہی آدمی تھے، ۱۸ ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ
(۳ دسمبر ۱۹۷۳ء) کو دہلی سے بذریعہ طیارہ بمبئی اور ۷ دسمبر ۲۲ ذی قعدہ کو بمبئی سے
کراچی روانگی ہوئی اور اگلے دن بخیریت مکہ معظمہ پہونچ گئے، ایام حج کے قرب کی وجہ سے
مکہ میں ہجوم بہت تھا اس لئے زیادہ تر قیام مدرسہ صولتیہ میں رہا، ۷ ذی الحجہ مستقلاً
سعدی صاحب کے یہاں منتقل ہو گئے، حج سے فراغت کے بعد ۱۵ ذی الحجہ (۹ جنوری)
کو رات کو بدر میں قیام کر کے اگلے دن مدینہ طیبہ پہونچے اور حسب معمول مدرسہ علوم شرعیہ
میں قیام ہو گیا۔

۱۳۹۴ھ میں پھر ہندوستان کا سفر پیش آیا جس میں کچھ اشارۂ غیبی کو بھی دخل تھا،
شیخ نے اس بنا پر رمضان ہندوستان میں گذارنے کا ارادہ کر لیا اور ۱۵ رجب ۱۳۹۴ھ
(۴ اگست ۱۹۷۴ء) کو مکہ مکرمہ سے روانگی ہوئی اور اسی روز بمبئی پہونچ گئے۔

---

[۱] تفصیل پچھلے باب میں گذر چکی ہے۔ [۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی نمبر ۶ صفحہ ۱۲۰

بمبئی سے چل کر ۹ راگست ۷۷ء ۲۴ شعبان ۹۷ھ کو نظام الدین پہونچنا ہوا، ۱۳ راگست ۷۷ء مطابق ۲۸ شعبان ۹۷ھ کو بخاری شریف کا ختم ہوا۔ اول مسلسل بالاولیت کی حدیث پڑھی گئی اس کے بعد مولوی یونس صاحب نے بخاری کی آخری حدیث پڑھی، متن دونوں کا شیخ نے پڑھا، ۱۲ رمضان المبارک دوشنبہ ۱۹ ستمبر کو شیخ اپنے معمول کے مطابق عصر کے بعد ہی دار جدید میں پہونچ گئے۔

عشرۂ اولیٰ میں مولوی زبیر نے، وسطیٰ میں مولوی خالد نے اور آخر میں مولوی سلمان حسنی نے قرآن شریف ختم کیا۔ سہارنپور سے چل کر کاندھلہ، پانی پت، سرہند ہوتے ہوئے بذریعہ کار رائیونڈ پہونچے اور وہاں سے تبلیغی اجتماع میں شرکت کرکے ڈھڈیاں، راولپنڈی اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہونچے اور وہاں سے سیدھے جدہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ مکہ معظمہ میں عمرہ سے فارغ ہوئے اور قیام فرمایا، اور مناسک حج ادا کئے۔[1] اس سال مولانا انعام الحسن صاحب بھی حج میں شریک تھے۔ حج سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ واپسی ہوگئی۔

۱۳۹۸ھ میں پھر ہندوستان کا سفر پیش آیا جو ۱۴ جمادی الثانیہ ۱۳۹۸ھ ۲۱ جون ۱۹۷۸ء کو شروع ہوکر ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو اختتام پذیر ہوا۔ اس سفر میں بھی رمضان المبارک دار الطلبہ جدید میں گذرا۔ عشرۂ اولیٰ میں مولوی سلمان صاحب نے، ثانیہ میں مولوی خالد نے اور ثالثہ میں مولوی زبیر صاحبزادہ مولانا انعام الحسن صاحب نے قرآن شریف ختم کیا۔ بیرون ممالک سے بہت سے ممتاز اہل تعلق آئے تھے، راقم سطور اور اس کے رفقاء بھی تین شب کے لئے حاضر ہوئے۔

رمضان سے فارغ ہوکر کراچی ہوتے ہوئے جدہ کی روانگی ہوئی، عمرہ کیا اور

---

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی نمبر ۷

بخار کی وجہ سے مشکل تھا اس لئے جدہ سے براہ راست مدینہ طیبہ روانگی ہوگئی۔

۲۴ رمئی ۱۹۷۳ء کو سعدی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ بسلسلہ تابعیہ جو درخواست جلالۃ الملک کو بھیجی گئی تھی اس کی منظوری کی اطلاع آگئی ہے، کچھ عرصہ کے بعد اس کی تکمیل ہوگئی، ۲۱ رجون ۱۹۷۳ء کو تابعیہ شیخ تک پہونچ گیا، اس پر انھوں نے ہجرت کی نیت کرلی، تابعیہ ملنے کے بعد جو مکتوب اس عاجز کے نام تحریر فرمایا گیا ہے اس میں تحریر ہے:

"تابعیہ ملنے کے بعد بجائے مسرت کے فکر غالب ہوگیا کہ معلوم نہیں وطنیت کے آداب کی رعایت کرسکوں گا یا نہیں، دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ یہاں کے آداب کی رعایت کرادے۔"[1]

مکتوب پر پہلی مرتبہ شیخ الحدیث مہاجر مدنی تحریر ہے۔

تابعیہ مل جانے کے بعد جمادی الثانیہ ۱۳۹۳ھ میں پھر ہندوستان کا سفر پیش آیا اور کراچی، دہلی ہوتے ہوئے سہارنپور پہونچنا ہوا، ۱۰ رشعبان، ۸ ر[illegible] کو مسلسلات بخاری کا ختم ہوا، اس سال ۱۳۹۳ھ کے رمضان میں ہجوم پہلے سے بھی بڑھا ہوا تھا، پہلا اور تیسرا عشرہ مولوی سلمان کا تھا، اور دوسرا مولوی خالد کا، ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں حجاز واپسی ہوگئی، جدہ سے براہ راست مدینہ طیبہ روانگی ہوئی، اس قیام میں خدام اور احباب نے بہت سے مبارک خواب دیکھے اور مبشرات ہوئے[2] امسال سہارنپور کا رمضان ملتوی کیا گیا، اہل تعلق کو اطلاع کردی گئی کہ رمضان اپنی اپنی جگہ کریں۔[3]

۱۳۹۴ھ اور ۱۳۹۵ھ کا رمضان بھی ہندوستان، سہارنپور دارالطلبہ جدید کی مسجد میں سالہائے سابق کی طرح اسی شان سے ہوا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، ۱۳۹۶ھ

---

[1] مکتوب مورخہ ۱۹ رجون ۱۹۷۳ء [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی نمبر ۶ ص ۲۳۲ تا ۲۴۴ نیز ۱۴۲ تا ۱۴۳

[3] ملخص و مقتبس از آپ بیتی نمبر ۶ باختصار۔

کے رمضان میں تقریباً ایک ہزار معتکف ہو گئے تھے، اس لئے جگہ کی تنگی رہی، اور ایک عشرہ سے زیادہ کسی کو اعتکاف کی اجازت نہیں ملی، سابق جیسے اسبق کے برخلاف اس مرتبہ حضرت مولوی سلمان صاحب نے تراویح میں قرآن شریف سنایا۔

۱۳۸۷ھ (جولائی ۱۹۶۷ء) کا رمضان پاکستانی خدام اہل تعلق کے اصرار اور قدیم خواہش و تمنا کی بنا پر فیصل آباد (سابق لائل پور) میں ہونا طے پایا، اس قیام کے خاص داعی و منتظم و ذمہ دار مولانا مفتی زین العابدین صاحب تھے جو حضرت کے ممتاز مجازین و تبلیغی جماعت کے اہم ذمہ داروں میں تھے، پاکستانی خدام، تبلیغی جماعت کے کارکنوں، حضرت رائے پوری سے تعلق رکھنے والوں، اور مدارس عربیہ کے اساتذہ و فضلاء نے اس موقعہ کو غنیمت بلکہ نعمت سمجھا، اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، قیام دارالعلوم فیصل آباد اور اس کی مسجد میں تھا، یہ رمضان پوری مشغولیت، ذہنی یکسوئی اور روحانی فیوض کے ساتھ گذرا، معمولات کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ:۔

عشاء کی اذان سے نصف گھنٹہ قبل شیخ کی خصوصی مجلس ہوتی، علی العموم شیخ مراقب تشریف فرما رہتے، مجمع بھی حلقہ بنا کر مراقب ہوتا، تھوڑی دیر اس سکوت و مراقبہ کے بعد نئے آنے والوں کی بیعت کا سلسلہ شروع ہوتا (جن کی تعداد روزانہ تقریباً ۴۰ ہوتی) حضرت کی طرف سے مولوی احسان صاحب استاد مدرسہ عربیہ رائے ونڈ لاہور، بیعت سے پہلے ضروری اعلانات کرتے کہ حضرت شیخ آہستہ آہستہ بیعت کے کلمات ارشاد فرماتے، اور مولوی احسان صاحب باواز بلند کہتے جاتے، سارا مجمع بیک زبان ان کی اقتداء میں بیعت کے کلمات اپنی زبان سے ادا کرتا، اس سال تراویح میں صرف سوا پارہ قرآن ہوتا تھا، تراویح کے بعد سورۂ یٰسین کا ختم ہوتا، پھر دعا، پھر کتاب

باب ہفتم

انگلستان اور جنوبی افریقہ کے یادگار دعوتی و تربیتی سفر

انگلستان کا پہلا سفر

جون ۱۹۷۹ء میں حضرت شیخ پہلی بار انگلستان تشریف لے گئے۔ آپ کا یہ سفر آپ کے خلیفہ مجاز مولوی یوسف متالا صاحب کی دعوت پر ہوا، انھوں نے "ہولکمب بری" (HOLCOMB BURY) لنکا شائر میں ایک بڑا دینی عربی مدرسہ دارالعلوم ہولکمب بری کے نام سے کئی سال پیشتر قائم کیا تھا جو برطانیہ کا سب سے بڑا عربی مدرسہ اور تربیتی و دعوتی مرکز بن گیا ہے[1]، یہ مدرسہ بڑی شہری آبادی بولٹن سے ۸-۱۰ میل کے فاصلہ پر ہولکمب ہل (HOLCOMB HILL) "نامی پہاڑی پر واقع ہے یہ اصل میں ایک سینی ٹوریم تھا جو کسی وجہ سے چھوڑ دیا گیا، اس کو غالباً ۱۹۷۳ء میں ایک کروڑ پندرہ ہزار پونڈ کے عوض دارالعلوم کے لئے خرید لیا گیا۔

حضرت شیخ ۲۴ر جون ۱۹۷۹ء کو ½۱۰ بجے شب میں مانچسٹر کے ہوائی اڈہ پر اترے، قرب و جوار اور دور دراز سے سیکڑوں آدمی ان کے استقبال اور دیدار کے لئے

---

[1] ۱۹۸۳ء کے سفر انگلستان میں راقم سطور نے مدرسہ کو دیکھا اور وہاں ایک شب گذاری اس مدرسہ کے بانی مولوی یوسف متالا، اور ان کے بھائی مولوی عبدالرحیم متالا پر حضرت شیخ کی بڑی توجہ اور شفقت تھی اور یہ دونوں بھائی شیخ کے بڑے مخلص خدام اور منتسبین میں تھے۔

پہونچ چکے تھے آپ جس جگہ کار سے اترکر اپنے کمرہ تک پہیوں والی کرسی کے ذریعہ آتا تھا، وہاں لوگ دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہوگئے اور ان کو آپ کی ایک جھلک دیکھنے کا موقعہ مل گیا، نماز عشاء کے بعد جبکہ آدھی رات کا وقت تھا آپ نے لوگوں سے مصافحہ کیا قریب قریب ایک گھنٹہ اس عمومی ملاقات میں لگ گیا، ۱/۲ ۱ بجے سوکر ۴ بجے فجر کے لئے اٹھ گئے اس کے بعد سے باقاعدہ روزانہ کا پروگرام شروع ہوگیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اوراد و وظائف ۱/۲ ۸ بجے ناشتہ، ۱/۲ ۱۰ بجے سے ۱/۲ ۱۱ تک تصوف و تزکیہ سے متعلق شیخ کی کسی کتاب سے تعلیم، ایک بجے دوپہر کا کھانا، ۱/۲ ۳ بجے ظہر کی نماز، نماز کے بعد مشائخ کا معمول ختم خواجگان اور اجتماعی دعا، پھر ذاکرین کا ذکر بالجہر اور بقیہ لوگوں کی درود و استغفار اور تسبیحات میں مشغولیت اس کے بعد ۶ بجے شام کی چائے ۱/۲ ۶ بجے سے ۱/۲ ۷ تک مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کا بیان ۸ بجے نماز عصر نماز کے بعد شام کا کھانا، پونے دس بجے مغرب کی نماز، اور نماز کے بعد نماز ہی کی جگہ میں قریب پون گھنٹہ کی شیخ کی عمومی مجلس، پھر ۱/۲ ۱۱ بجے عشاء کی نماز شام کے ۶ بجے سے قریب وقریب کے لوگ بھی اپنی دکانوں، دفتروں، اور کارخانوں وغیرہ سے چھٹی پاکر جوق در جوق مدرسہ میں پہونچ جاتے تھے اس وقت بھی مجمع ہزاروں کا ہوتا تھا، شیخ کی ہدایت پر یہ مجمع کم سے کم ایک ہزار بار درود شریف کا ورد پورا کرلیتا تھا، حضرت نے پہلے ہی دن مجلس میں فرما دیا تھا کہ مجھے دیکھنے کے لئے جمع ہوجانے سے کچھ نہیں ملے گا، جو کچھ ملے گا، کچھ کرنے سے ملے گا کم از کم اتنا ضرور کرو کہ ایک ہزار بار درود شریف ہر شخص پڑھ لے، اس کے علاوہ اوقات میں بھی غیر ضروری باتوں سے احتراز کرتے ہوئے دل و زبان کو زیادہ سے زیادہ اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو، درود شریف پڑھنے کے بعد ان لوگوں کی بیعت شروع ہوتی تھی

جو حضرت سے بیعت ہونا چاہتے تھے اس بیعت میں ایمان کی تجدید گناہوں سے توبہ اور آئندہ کے لئے اطاعت و راست بازی کا عہد و اقرار، حضرت اپنی زبان ... سے بیعت کے الفاظ فرماتے اور ملک عبد الحفیظ صاحب مائک پر دہراتے۔

شیخ کا قیام انگلستان میں ۱۰۱ دن رہا انھیں میں سے درمیان کا ایک دن (پنجشنبہ ۲۸ جون) برطانیہ کے تبلیغی مرکز ڈیوزبری کے لئے رکھا گیا تھا، پورے قیام میں بس یہی ایک سفر دار العلوم سے باہر کا فرمایا گیا۔ صبح ½۱۰ گیارہ بجے روانگی ہوئی ۱۲ بجے ڈیوزبری سے چند میل دور باٹلی پہونچ کر ذرا دیر کا قیام فرمایا، کیونکہ یہاں خواتین کے بیعت کا پروگرام تھا۔ آپ ڈیوزبری سے روانہ ہوئے تو وہاں متعین کا بیشتر حصہ بھی آپ کے آگے پیچھے اس طرح ہو لیا جیسے شمع کے ساتھ پروانے، ان کے علاوہ ڈیوزبری کے جوار سے جو آمد شروع ہوئی تو ہر طرف سے موٹریں ہی موٹریں آتی ہوئی نظر آتی تھیں، اور اس شعر کی تصدیق ہوتی تھی ؎

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

ڈیوزبری کے علاوہ دار العلوم سے ۵۰ میل پاس علاقہ کے بڑے شہر بولٹن میں آپ ہی کے نام کی زکریا مسجد واقع ہے۔ یہاں اتوار یکم جولائی کو ۱۲ بجے دن سے ظہر تک کا پروگرام تھا جہاں مفتی محمود حسن صاحب کا بیان اور خواتین کی بیعت عمل میں آئی اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں ہوا۔

۵ جولائی ۱۹۷۹ء کی صبح ۹ بجے آپ مانچسٹر ایرپورٹ سے پرواز کرکے ۱۰ بجے کے قریب لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر تشریف لائے یہاں سے آپ کو زیمبیا کے ذریعہ

دہلی تشریف لے جانا تھا، ۸ بجے وہاں سے پرواز ہوئی اور آپ بخیر و عافیت دہلی پہونچے۔[1]

جنوبی افریقہ کا تاریخی رمضان

شیخ کے سن مبارک (حضرت شیخ کی اس وقت عمر ۷۶ سال تھی)، ضعف و امراض اور عوارض دیکھتے ہوئے جن کا حال یہ تھا کہ نقل و حرکت تو بڑی چیز ہے خود سے کروٹ بدلنے اور اٹھ کر بیٹھ جانے سے بھی معذور تھے، رمضان گذارنے کے لئے جنوبی افریقہ کے سفر کا ارادہ و فیصلہ خدا کی قدرت کی ایک نشانی، اور شیخ کی ایک کھلی کرامت تھی جس کی توجیہ اس کے سوا کسی چیز سے نہیں کی جا سکتی کہ اللہ تعالیٰ کو اس دور دراز ملک کے (جو اسلامی و مغربی تہذیب کے تصادم و تقابل کی خاص جولان گاہ ہے اور جہاں لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانی نسل کے فرزندان توحید آباد ہیں جنھوں نے ابھی تک دولت و معربیت کے فتنوں کے باوجود اسلام کی امانت کو اپنے سینہ سے لگائے رکھا ہے اور جن کی نسلوں میں دین کا احترام اور اہل دین کی قدر دانی برابر منتقل ہوتی رہی ہے) مسلمانوں کی کوئی ادا پسند آئی، اور ان کو فائدہ پہونچانے کے لئے پیاسوں کے کنویں پر جانے کے بجائے (جو وہ اپنے متعدد سفر کرتے رہے ہیں) کنویں کو پیاسوں کے پاس بھیج دیا، یہ طویل سفر متعدد اشارات غیبی اور مبشرات کی بناء پر کیا گیا، اس سفر میں دین کے شائقین و طالبین اور اہل تعلق نے جس طرح پروانہ وار ہجوم کیا، اور جس طرح ملک کے دور دراز گوشوں کے لوگ ایک مقناطیسی کشش سے جمع ہوئے اور انھوں نے

---

[1] یہ معلومات اختصار کے ساتھ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی کے مضمون شائع شدہ الفرقان بابت ماہ اگست ستمبر ۱۹۷۲ء و رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ سے ماخوذ ہیں، مولوی عتیق صاحب ان مجالس میں شریک اور حالات کے عینی شاہد تھے۔

اپنی شیفتگی اور گرویدگی کا اظہار کیا، اس نے تیرہویں صدی کے ثلث اول میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے دو آبہ کے دورہ اور سفر حج و ہجرت کے دور کی یاد تازہ کر دی، وہاں کے طالبین کو جو دینی اور روحانی فوائد حاصل ہوئے ان سے ان بشرات کی تصدیق بھی ظاہر ہو گئی، خود حضرت شیخ اپنے ایک خادم کے نام ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"بہت سے بشرات و منامات کے پیش نظر کئی سال جنوبی افریقہ میں رمضان مبارک گذارنے پر اصرار اور زور احباب کی طرف سے ہو رہا ہے معذوری و ضعف و ناتوانی اور بیماری کی وجہ سے میری ہمت بالکل نہیں کہ وعدہ کروں، مگر بشرات و منامات کی کثرت کی وجہ سے ہمت کر لی۔"

شیخ نے اس سفر کے داعی خاص محرک مولوی یوسف تلا صاحب سے کچھ شرطیں بھی کیں اول یہ ہے ایک یہ بھی کہ میرا اور میرے رفقاء کا کرایہ میرے ذمہ ہوگا، ان لوگوں کے علاوہ جن کا معمول ہمیشہ ہدیہ بھیجنے کا ہے کوئی ہدیہ لینے کی اجازت نہیں، کھانے میں تکلف نہ کیا جائے، بہت سادہ کھانا ایک دو قسم کا ہو، دوستوں کو اس پر راضی کر لیں کہ وہ مجھے ایک دو دن کے لئے کہیں نہ لے جائیں، آنا جانا میرے بس کا نہیں، البتہ ذاکرین کو اکٹھا کریں جو اہتمام سے ذکر کریں، اس دوران افریقہ کے متعدد حضرات کی جانب سے سفر کا کرایہ اور دیگر اخراجات ادا کرنے کی پیش کش پہونچی لیکن آپ نے اسے منظور نہیں فرمایا اور اپنا اور اپنے خدام کا کرایہ اپنی جیب خاص سے مرحمت فرمایا، جو کہ پاکستانی روپیہ کے حساب سے دو لاکھ روپیہ بنتا تھا۔

مولانا محمد سعید انگار صاحب کی درخواست پر جو اسلامک سنٹر ری یونین کے ڈائرکٹر ہیں آپ نے اسٹینگر (STANGER) جاتے ہوئے ری یونین کا (RE UNION)

سفر منظور فرمالیا، اور شرط کردی کہ وہاں خانقاہوں کے قیام اور ذکر کے اہتمام کی کوشش کریں گے آپ ۴ر شعبان ۱۴۰۱ھ (۸ر جون ۱۹۸۱ء) بروز ہفتہ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، مکہ مکرمہ میں عمرہ سے فارغ ہوئے، وہاں ۹-۱۰ دن قیام کرکے ۱۶ر جون ۱۳ر شعبان کو جدہ سے ری یونین کے لئے روانہ ہوئے، ری یونین (REUNION) پہونچ کر وہی معمولات شروع کردیئے گئے، جو رمضان میں ہوتے ہیں، ۳-۴ دن وہاں ٹھہر کر ۲۰ر جون شنبہ کی صبح سینٹ ڈینس (SAINT DENIS) سے سینٹ پیر (SAINT PIERRE) تشریف لے گئے، اگلے دن ۲۱ر جون کو ڈربن (DURBAN) کے لئے روانہ ہوئے، وہاں بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا، آپ کی تشریف آوری سے قبل ہی لوگوں نے داڑھیاں رکھنا شروع کردی تھیں، اور دینی جذبہ حیرت انگیز طور پر بڑھ چکا تھا، ۲۹ر شعبان کو آپ اپنے تمام مہمانوں کے ساتھ اسٹینگر[1] (STANGER) کی جامع مسجد منتقل ہوگئے، اور آپ نے پورے ماہ کے اعتکاف کی نیت کرلی۔

یہ زمانہ اس علاقہ میں (ہندوستان کے برخلاف خط استوا اوپر ہونے کی وجہ سے) انتہائی سردی کا تھا، لیکن اسٹینگر فراز نشیب پر واقع ہے، اسی لئے یہاں موسم قدرے معتدل رہتا ہے، اسٹینگر کی جامع مسجد کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ مسجد نہایت وسیع اور تین حصوں پر مشتمل ہے، اوپر کے حصہ میں تقریباً بارہ سو افراد کی گنجائش ہے، اور نیچے دو حصوں میں تقریباً ایک ہزار افراد سما سکتے ہیں، بیت الخلاء وغیرہ کافی تعداد میں ہیں، اگر دیگیں گاڑیاں کھڑی کرنے کی وسیع جگہ ہے، گرم، ٹھنڈے پانی کا بندوبست بھی ہے، محل وقوع نہایت پرسکون ہے۔

ایک بیان کے مطابق ہفتہ اتوار کو چھ سات ہزار کا مجمع ہوجانا، جگہ کی کمی کو

[1] اسٹینگر (STANGER) جنوبی افریقہ میں صوبہ نیٹال (NATAL) کا ایک شہر ہے۔

پورا کرنے کے لئے تینوں اطراف میں چار بڑے خیمے نصب کئے گئے، ہفتہ اتوار کو مجمع کا نظم کرنے کے لئے وائرلیس سیٹ کرنا پڑا، ایک انفارمیشن سینٹر (معلوماتی مرکز) مسجد سے متصل عارضی طور پر قائم کیا گیا، مہمانوں کی خدمت کے لئے سو افراد پر مشتمل ایک جماعت متعین تھی، جن میں پچاس سحر کے لئے، اور پچاس افطار کے لئے مخصوص تھے۔

رمضان کے اس قیام سے اس پورے علاقہ میں دین کا ایک نیا ذوق پیدا ہوا، لوگوں کی ہمتیں بلند ہوگئیں، بہت سی جگہ مجالس ذکر کے قیام کا سلسلہ شروع ہوگیا، بہت سی جگہ نئی نئی مسجدوں کی بنیاد پڑی، مدارس دینیہ اور مکاتب قرآنیہ کا قیام عمل میں آیا، اچھے اچھے صاحب ثروت گھرانوں میں دینی علم کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے بچوں کو دور دراز کے مدارس دینیہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا، دوسری طرف تبلیغی جدوجہد میں (جو کئی سال سے جنوبی افریقہ میں جاری ہے) نئی جان پڑی، دور دراز علاقوں سے سو سو دو دو سو میل کی مسافت سے بلکہ دوسرے افریقی ملکوں سے بھی لوگ زیارت کے لئے آتے رہتے، وہ اپنے جیب و دامن کو فیوض و برکات سے بھر بھر کر واپس جاتے، جب ان کے وقت بڑے متاثر و آبدیدہ نظر آتے۔

حضرت نے پورے ماہ کے اعتکاف کی نیت فرمالی، معمولات حسب ذیل تھے:۔

بعد ظہر ختم خواجگان و دعا، پھر مجلس ذکر، بعد عصر کتابی تعلیم، پھر افطار، بعد مغرب نوافل، بعد طعام مجلس اور بیعت، بعد تراویح ختم یٰسین شریف اور دعا، پھر فضائل درود شریف کی خواندگی، پھر واردین و زائرین سے مصافحہ کا سلسلہ شروع ہوتا، اور عموماً گھنٹہ بھر بلکہ زیادہ ہی وقت لگتا، معتکفین و زائرین رات کو کچھ نوافل و تلاوت میں شب بیدار رہتے، کچھ آرام کرتے پھر سحری اور تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے، فجر تا اشراق

یہاں مولوی محمد گارڈی نے پورے دو جہاز چارٹر کر رکھے تھے، واشٹ ریور ریجن بڑا مجمع
تھا، لیکن ہر جگہ کی طرح پولیس اور فوج کا پورا انتظام، یہاں تو مسلم سیاہ فام لوگوں کا مجمع
بہت زیادہ تھا، اطراف واکناف سے آئے ہوئے لوگوں کا کل مجمع غفیر تھا تقریباً ۷۔۸ سو
سیاہ فام تھے، جنہوں نے قرآن مجید شروع کیا۔

یہاں سے روانہ ہو کر بذریعہ جہاز جوہانس برگ (JOHANNESBURG) پہونچے
یہاں بھی وہی معمولات جاری رہے جوہانس برگ سے کیپ ٹاؤن (CAPE TOWN) تشریف
لے جانا ہوا، یہاں جامعہ ازہر مصر و سعودی عرب کے پڑھے ہوئے جاوی علماء جو یہاں کے
قدیم باشندہ ہیں استقبال کے لئے موجود تھے آپ نے پہلے قبرستان جا کر فاتحہ پڑھی۔[1]

کیپ ٹاؤن میں علماء کی تنظیم کے صدر نظیم محمد صاحب نے جو اصلاً جاوی ہیں ان کی تعلیم
مکہ کی ہے حضرت کے استقبال میں تقریر کی، یہاں علماء بہت مانوس ہوئے کیپ ٹاؤن
سے دوبارہ جوہانس برگ واپسی ہوئی، جوہانس برگ سے لیناشیا (LENASIA) آنا ہوا،
تقریباً تین ہزار کا مجمع تھا، مصافحہ میں خاصی دیر لگی، بچوں کی بسم اللہ ہوئی، اور ایک
انگریز مسلمان ہوا، ۱۵ اگست ۲۴ شوال کو لیناشیا قیام رہا، اور بھی چند اشخاص مسلمان
ہوئے ۱۶ اگست ۲۵ شوال کو بھی وہیں قیام رہا، چلتے وقت تقریباً چار ہزار کا مجمع تھا
مصافحہ میں بہت وقت لگا، ۱۷ اگست ۲۶ شوال کو زامبیا (ZAMBIA) کے لئے
روانگی ہوئی، زامبیا والوں نے ایک مستقل فوجی جہاز زامبیا سے چارٹر کر کے جوہانس برگ

---

[1] عزیزی مولوی علی آدم ندوی ساکن کیپ ٹاؤن نے بتایا کہ یہاں کثرت سے انڈونیشیا کے جلاوطن
عرب علماء و مشائخ دفن ہیں جن کو ڈچ اپنی حکومت کے زمانہ میں سیاسی قیدی بنا کر یہاں لا کر چھوڑ دیتے
تھے ان میں بعض صاحب نسبت مشائخ اور صاحب کرامات بزرگ ہوتے تھے۔

بھیجا جس کا کرایہ ہندوستانی روپیوں میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار ہوتا ہے، یہ جہاز گیارہ سیٹوں کا تھا۔ رخصت کے وقت ہزاروں کا مجمع تھا، تقریباً سو سے زیادہ کاریں ہی تھیں، چونکہ لوٹائی وقت تھا، اس لئے پورے ساؤتھ افریقہ سے احباب کھنچ کھنچ کر پہونچ گئے، مجمع بھی اماں کر رو رہا تھا، راستہ میں خصوصی انتظام کی بنا پر مسلمانوں کی ایک چھوٹی بستی چیپاٹا (CHIPATA) پر جہاز اترا، احباب کا مجمع ایک ہزار کے قریب تھا، اللہ تعالیٰ نے چیپاٹا میں جہاز کو ایک بڑے خطرے سے بچا لیا، اور بخیریت واپسی ہو گئی، اس سفر میں کھانے میں برکت، خطرے سے سلامتی وغیرہ کے ایسے متعدد واقعات پیش آئے جو خاص ان خاص کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں، جمعہ بھی چیپاٹا میں ہوا، ایک دینی مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

۲۲ اگست ۲۱ شوال کو چیپاٹا سے لوساکا (LUSAKA) روانگی ہوئی، لوساکا کا پورا ایرپورٹ مجمع سے بھرا ہوا تھا، کئی ہزار کا مجمع تھا، نعرۂ تکبیر سے پورا ایرپورٹ گونج گیا، یہاں کے میزبانوں نے انتظامات خوب کر رکھے تھے، شامیانوں میں کئی ہزار مجمع کی گنجائش تھی، حضرت کے میزبان ابراہیم حسین ملبات والا صاحب نے پورے شہر لوساکا کے مسلمانوں کی دعوت کر رکھی تھی، تقریباً ڈھائی ہزار آدمیوں نے کھانا کھایا، آپ نے ۲۳ اگست کو دارالعلوم کا معائنہ کیا اور وہاں کے ذمہ داروں کی درخواست پر اس کا نام مدرسہ رحمانیہ رکھا۔

انگلینڈ کا دوسرا سفر

۲۵ اگست ۱۹۸۱ء ۲۴ شوال ۱۴۰۱ھ کو لوساکا سے انگلینڈ کے لئے روانگی ہوئی، یہ انگلستان کا دوسرا سفر تھا، ایرپورٹ جاتے ہوئے حضرت کی گاڑی کے پیچھے

ایک سو پچاس کا رہی تھیں پولیس کی کار ہیں ــــــ اس کے علاوہ لاوسا کا سے جہاز روانہ ہو کر تونس کے ہوائی اڈہ پر ٹھہرا ہوا، یہاں حضرت کے رفقائے سفر نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی) بخیر و عافیت لندن کے ہوائی اڈہ پہونچا، یہاں سے جہاز کے ذریعہ مانچسٹر (MANCHESTER) جانا تھا، یہاں کے دوستوں نے پچاس سیٹوں والا ایک جہاز پورا چارٹر کر رکھا تھا جس کا کرایہ اٹھارہ سو پونڈ تھا، بخیر و عافیت مانچسٹر پہونچے اور دن کو ۲ بج کر ۲۵ منٹ پر دارالعلوم بولٹن (BOLTON) پہونچ گئے، اور وہ نظام الاوقات جاری کر دیا گیا جو ہر جگہ جاری رہا، قرآن شریف کے اختتام و افتتاح اور بیعت کے اجتماعات بھی ہوتے رہے، ۲۹ راگست ۸ رشوال یکشنبہ کو چونکہ تعطیل کا دن تھا، اس لئے مجمع تقریباً ۳-۴ ہزار کا تھا۔

۳۰ راگست ۹ رشوال یکشنبہ کو ڈیوزبری (DUWSBURY) کے مرکز تبلیغ پہ جانا تھا، راستہ میں بائلی (BATLEY) پر کچھ دیر ٹھہرنا ہوا، مسجد میں عورتوں کا مجمع تقریباً ۲ ہزار کا تھا، جو اوپر کے حصوں اور نیچے کے حصوں میں جمع تھیں، یہ ساری عورتیں بیعت کے لئے آئی تھیں، ۱ بج کر ۴۰ پر ڈیوزبری پہونچے، جہاں مدرسہ کی عمارت زیر تعمیر ہے، یہاں سے غیر ملکوں کے لئے تقریباً ۳۵ جماعتیں نکلیں، اور ان کے مصافحے ہوئے، مجمع تقریباً پانچ ہزار کا تھا، ملک کے کونے کونے سے زائرین آئے تھے، ڈیوزبری سے بلیک برن (BLACBURN) مدرسہ کے تین شہید حضرات کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے تشریف لے گئے، جو گذشتہ سال ایک حادثہ میں شہید ہو گئے تھے۔

۵ ستمبر ۵ رذی قعدہ کو دارالعلوم میں جمعیۃ علماء برطانیہ کا اجلاس ہوا، حضرت شیخ اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، ۸ ستمبر ۸ رذی قعدہ یکشنبہ کو ۲ طلبہ کی

دستار بندی ہوئی، اور بخاری شریف کا اختتام، اور مشکوٰۃ کا افتتاح بھی ہوا، آج مجمع بہت زیادہ تھا، پورا مدرسہ اور شامیانے مجمع سے بھرے ہوئے تھے، حضرت شیخ پر تشریف لائے، کنارے کنارے طلبہ تپائیوں پر اپنی حدیث کی کتابیں لئے بیٹھے تھے، پہلے حدیث مسلسل بالاولیۃ ہوئی، جس کی حضرت نے سامعین کو اجازت دی، شیخ الحدیث مولانا اسلام الحق صاحب نے بخاری شریف کی آخری حدیث پڑھی اور نئے سال کی بخاری کا افتتاح بھی کیا، اس کے بعد مشکوٰۃ کی جماعت کی باری آئی، آج تین مدرسین کو شیخ کی طرف سے ٹوپی اور دستار عنایت ہوئی، اس ملک برطانیہ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے یہ منظر دیکھا، ۲۵ علما، ۹ قرا اور ۷ حفاظ تیار ہوئے، اس کے بعد اذان و جماعت شروع ہوئی، آج تقریباً سات ہزار کا مجمع تھا، شدت علالت کی وجہ سے ڈاکٹروں کے مشورے سے چند دن اسپتال میں بھی رہنا پڑا، ۱۵ ستمبر تک اسپتال ہی میں رہنا ہوا۔

۱۶ ستمبر ۱۹ ذی قعدہ کو سعودیہ کا سفر تھا، یہ چونکہ چھٹی کا دن تھا، اس لئے مجمع بے انتہا تھا، پورا مدرسہ اور پوری سڑکیں بھری ہوئی تھیں، تقریباً ۹-۱۰ ہزار کا مجمع تھا، ۱ بجکر ۲۰ منٹ پر مانچسٹر ایئرپورٹ پہونچے، ۲ بجے بخیر و عافیت لندن کے ہیتھرو (HEATHROW) ایئرپورٹ پر اترنا ہوا، وہاں سے انٹرنیشنل ایئرپورٹ آئے، ۴ بجکر ۵۴ منٹ پر جہاز نے پرواز کی، رفقائے سفر نے جہاز میں احرام باندھا، حضرت نے علالت کی وجہ سے جدہ کی نیت شروع ہی سے کر رکھی تھی، ۱۰ بجکر ۸ منٹ پر بخیر و عافیت جدہ پہونچنا ہوا۔

باب ہشتم

علالت کا تسلسل و وفات حسرت آیات

طویل علالت اور سفر ہندوستان

حضرت شیخ کی علالت کا سلسلہ جیسا کہ اوپر کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے بہت طویل تھا، اور سالہا سال ممتد رہا، اس میں بار بار ایسے مرحلے آئے کہ اہل تعلق اور محبین کو زندگی کی طرف سے سخت خطرہ اور تشویش اور بعض اوقات مایوسی ہونے لگتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کو ابھی ارشاد و تربیت، نئے مشائخ اور مریدوں کے علوم و تحقیقات کی اشاعت، ان کی علمی و تصنیفی یادگاروں کی حفاظت اور توسیع، تبلیغی جماعت کی نگرانی اور سرپرستی، اور زیر تربیت افراد کی تکمیل کا جو کام لینا تھا، اس کے لئے بار بار اس فوری خطرہ اور تشویش کو دور فرماتا رہا، اور اہل تعلق کی آس بندھتی رہی۔

علالت و ضعف کی اسی حالت میں ۱۵ محرم ۱۴۰۲ھ (۱۳ نومبر ۱۹۸۱ء) کو حضرت شیخ مدینہ طیبہ سے ہندوستان تشریف لائے، اور ۱۰ روز دہلی قیام رہا، مرض کا اشتداد اور ضعف کا شدید غلبہ ہوا، اور صحت بہت نازک مرحلہ پر پہونچ گئی، اہل تعلق اور اہل الرائے کا مشورہ اور اصرار ہوا کہ دہلی میں کسی اچھے ہسپتال میں داخل کیا جائے

جہاں پوری ذمہ داری و ہمدردی کے ساتھ علاج ہوتا ہو، چنانچہ ہولی فیملی (HOLY FAMILY) میں داخل کرنے کا مشورہ ہوا۔ وہاں مکمل طبی معائنہ، ضروری ایکسرے اور ہر طرح کے امتحانات ہوئے۔

معالجین کو کینسر کا شبہ تھا، کئی بار ضعف کی وجہ سے خون چڑھانے کی نوبت آئی اور متعدد بار امید و بیم کی حالت پیدا ہوئی۔ ان چیزوں راقم سطور، مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اور رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں عزیزان محمد ثانی، مولوی محمد معین اللہ، مولوی طاہر وغیرہ تھے زیارت و عیادت کے لئے دہلی گیا۔ وہاں شیخ کے شدید ضعف و علالت کی شدت کو دیکھ کر شدت سے تاب میں اس بات کا تقاضا ہوا کہ کسی طرح حضرت شیخ کو مدینہ طیبہ پہونچا دیا جائے مبادا کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس پر ہمیشہ قلق و ندامت ہو، اور مخالفین و معاندین کو شماتت کا موقع ملے، اس رائے میں مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند جو برابر حالات کا مطالعہ کر رہے تھے اور وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے بھی شریک تھے، اس رائے اور مشورہ میں ہم لوگوں سے کچھ آگے ہی تھے، بالآخر راقم سطور اور مولانا نے بڑی صفائی اور ایک حد تک جرأت و جسارت کے ساتھ منتظمین و تیمارداروں کی خدمت میں اپنی رائے پیش کی، حالات کا تقاضا تھا کہ ایک دن کی بھی تاخیر نہ کی جائے لیکن ذمہ داروں اور تیمارداروں نے (جن میں شیخ کے خادم خاص، صوفی الحاج ابو الحسن بھی پیش پیش تھے) اس سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ ابھی تو شیخ کو سہارنپور لے جانا ہے اور وہاں قیام کرانا ہے جس کی شیخ کو خواہش بھی ہے اور کئی بار اس کا ذکر بھی فرمایا۔

ہم لوگ اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے تھے، ان حضرات کے احترام میں دو باکشف اللہ۔ خاموشی اختیار کی۔

ہوئی فیصلی سے شیخ حافظ کرامت اللہ صاحب کی کوٹھی میں تشریف لائے جہاں آرام و علاج کی سب سہولتیں تھیں، ۴ر صفر ۱۴۰۲ھ (۲ر دسمبر ۱۹۸۱ء) کو سہارنپور تشریف لے گئے، اسی عرصہ میں ہم لوگوں کی دوبارہ حاضری ہوئی، اور دیکھا تو وہاں سے بہتر حالت پائی لیکن اطمینان اب بھی نہ تھا۔

مدینہ طیبہ واپسی

آخر اللہ نے ان کی آرزو اور مخلصین کی دعائیں قبول فرمائیں اور شیخ اپنے خدام و رفقائے خاص کے ساتھ ۸ر ربیع الاول ۱۴۰۲ھ (۴ر جنوری ۱۹۸۲ء) کو براہ کراچی جدہ کے لئے روانہ ہوئے، اور وہاں سے الحمدللہ بخیریت مدینہ طیبہ پہونچ گئے، علالت اور علاج کا سلسلہ جاری رہا، خدام کو ہندوستان میں کبھی تشویشناک اطلاعیں اور کبھی امید افزا خبریں ملتی رہیں۔

آخری ملاقات

اس عرصہ میں ۲۹ر ربیع الاول ۱۴۰۲ھ جنوری ۱۹۸۲ء کو رابطہ عالم اسلامی کی المجلس الاعلیٰ لمساجد اور المجمع الفقہی کی شرکت کے لئے میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں مکہ معظمہ حاضر ہوا، حضرت شیخ حسن اتفاق سے مکہ معظمہ ہی میں بھائی سعدی صاحب کے مکان پر فروکش تھے، اور ہمارا قیام اس سے متصل ہی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی کے مکان پر تھا، جس کا صرف چند گز کا فاصلہ ہے، حضرت شیخ ہمیشہ کے معمول کے مطابق بڑی بشاشت و شفقت سے پیش آئے

ضعف بہت تھا لیکن دماغ اسی طرح بیدار و حاضر تھا، میرے ساتھ از راہ شفقت جو معاملہ مدینہ طیبہ کے قیام میں فرماتے تھے اس کا اعادہ فرمایا، بھائی ابوالحسن سے کہا کہ علی میاں کو مدینہ طیبہ میں جو خمیرہ کھلاتے تھے وہ روزانہ دیں کرو، ٹھنڈے پانی کو بھی بار بار پوچھتے اور ہدایت فرماتے، اس وقت سب سے زیادہ حضرت کے قلب و دماغ پر جو چیز طاری اور حاوی تھی، وہ دارالعلوم دیوبند کا قضیہ تھا، دن میں دو مرتبہ حاضری ہوتی کوئی حاضری ایسی یاد نہیں جس میں دارالعلوم کی کوئی نئی خبر دریافت نہ فرمائی ہو اور اس کے اختلافات کے بارے میں اپنی دلی تشویش و فکرمندی کا اظہار نہ فرمایا ہو، میں نے مولانا محمد ثانی رحمہ اللہ کا ایک نیازنامہ بھی دیا اور عرض کیا کہ جب موقع ہو سن لیا جائے، فرمایا نہیں ابھی سنوں گا، غالباً مولوی طلحہ صاحب نے پڑھ کر سنایا، فرمایا اس کا جواب بھی لکھواؤں گا، اس وقت کیا معلوم تھا کہ حضرت دو ڈھائی مہینے کے فصل سے خادم و مخدوم اور مرید و مرشد اللہ کے یہاں پہونچ جائیں گے۔

ایک یادگار تعزیتی مکتوب

فروری ۸۲ء میں ہم دونوں کی لکھنؤ واپسی ہوئی، یہاں ہندوستان پہونچ کر عزیزی مولوی محمد ثانی مرحوم کا وہ حادثہ جاں گداز پیش آیا جس نے دل و دماغ کو مجروح اور اعصاب کو مضمحل کر رکھ دیا، عجیب بات ہے کہ ۹ فروری کو دن کے ۱۱ بجے یہ حادثہ پیش آیا اور اسی دن عصر کی نماز سے پیشتر حضرت شیخ کو مدینہ طیبہ ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع مل گئی، حضرت نے اس پر جو تعزیتی مکتوب میرے نام تحریر فرمایا، وہ ایک یادگار تاریخی نو

جس سے حضرت کی حاضر دماغی، حافظہ کے صحیح طور پر کام کرنے، انسیت کے ساتھ حضرت تعلق کا پورا اظہار ہوتا ہے، اور اس میں لطیف طریقہ پر اپنے سفر کے قرب کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے، وہ مکتوب یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

باسمہ سبحانہ

المخدوم المکرم حضرت الحاج علی میاں صاحب زاد مجدکم

بعد سلام مسنون، ۸/ فروری ۱۹۸۲ء کو ظہر کی نماز کے بعد عزیزی مولوی حبیب اللہ نے حادثہ جانکاہ کی خبر سنائی کہ ظہر سے پہلے جبکہ میں سو رہا تھا، [illegible] کا ملازم آیا اور یہ خبر بتا گیا کہ آج ساڑھے گیارہ بجے دن میں محمد ثانی حسنی کا انتقال ہوگیا

انا للہ وانا الیہ راجعون، اللّٰھم اجرنا فی مصیبتنا وعوضنا خیرا منھا، للہ ما أخذ ولہ ما أعطی وکل شیء عندہ بمقدار۔

ان العین تدمع والقلب یحزن	آنکھ اشکبار ہوتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے
ولا نقول الا ما یرضی ربنا، انا بفراقک	مگر ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو راضی
یا محمد لمحزونون۔	کرے اور ہم اے محمد تمہاری جدائی پر
	غمزدہ ہیں۔

علی میاں!

حضرت امام شافعیؒ کا وہ شعر یاد آرہا ہے جو انھوں نے حضرت امام عبدالرحمن بن مہدی کو ان کے صاحبزادہ کی تعزیت میں لکھا تھا ؎

انی معزیک لا انی علی ثقۃ	من الحیاۃ ولکن سنۃ الدین

میں تم سے تعزیت دین کی پیروی میں کر رہا ہوں، نہ کہ اس یقین پر کہ مجھے زندگی کا بھروسہ

فما المعزّى بباقٍ بعد ميته ولا المعزّي ولو عاشا الى حين

کیونکہ حقیقت ہے کہ وفات پاجانے والے کے بعد جس سے اس کی تعزیت کی جارہی ہے نہ وہ باقی رہنے والے ہیں اور نہ تعزیت کرنے والے ہی کو بقا ہے اگرچہ ایک مدت تک زندہ رہے۔

علی میاں! حادثہ جانکاہ کی خبر سن کر دل پر کیا گذری بیان نہیں کر سکتا مادر آپ کی پیرانہ سالی اور پے در پے حادثات کا تسلسل اور بھی موجب رنج و قلق ہے مگر محض رنج و قلق سے نہ تو جانے والے کو فائدہ نہ رہنے والے کو سکون! میں نے تو خبر سنتے ہی اپنے دستور کے موافق دوستوں کو ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کی تاکید شروع کر دی کہ میرے یہاں اصل یہی تعزیت ہے اور اس کے بہت سے واقعات میری "آپ بیتی" میں بھی گزر چکے ہیں اللہ تعالٰی مرحوم کی مغفرت فرمائے اجر جزیل عطا فرمائے اور پسماندگان کو خصوصاً آپ کو صبر جمیل۔

اس وقت رہ رہ کر عزیز مرحوم کی خوبیاں اور ادائیں یاد آرہی ہیں اور آپ کا خیال بھی بار بار آرہا ہے کہ آپ پر کیا گذر رہی ہوگی۔

قربان جائیے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ ہر حرکت و سکون کے اعمال کو ہمارے لئے بیان فرما گئے اور اللہ تعالٰی جزائے خیر دے ان صحابہؓ و محدثین کو جو ان سب چیزوں کو محفوظ فرما گئے۔ اس وقت بھی حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک تعزیتی مکتوب جو حضرت معاذ بن جبلؓ کو لکھوایا تھا نقل کرا رہا ہوں۔ حضرت معاذؓ کے ایک صاحبزادہ کا انتقال ہو گیا اس پر آپ نے یہ مکتوب مبارک لکھوایا:۔

من محمد رسول اللہ الی معاذ بن — اللہ کے رسول محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام)

علالت کا اشتداد اور زندگی کے آخری ایام

مارچ اپریل اور وسط مئی تک حضرت شیخ کی علالت وصحت وضعف وقوت کے بارے میں اسی طرح کی مختلف ومتضاد خبریں آتی رہیں جیسا کہ مہینوں سے معمول تھا۔ مئی ۸۲ء کی ابتدائی تاریخوں میں راقم سطور عزیزی سید سلمان ندوی سلمہ کے ساتھ قطر ولنکا کے سفر پر روانہ ہوا، وہاں غالباً ۱۴ یا ۱۵ مئی کو واپسی سے ایک شب پہلے خواب دیکھا کہ حضرت شیخ تشریف رکھتے ہیں مجھے دیکھ کر فرمایا کہ علی میاں! تمہیں معلوم نہیں کہ میں اتنا بیمار ہوں تم دیکھنے نہیں آئے، میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس کی بالکل خبر نہیں ہوئی مجھے اس عرصہ میں کوئی خط نہیں ملا۔

یہ بھی عرض کیا کہ اس حادثہ کا ہمارے پورے خاندان پر بڑا اثر ہے خاص طور پر محمد ثانی کی والدہ پر اب دیکھا تو حضرت شیخ وہاں پر موجود نہیں تھے، اس پر وہیں ماتھا ٹھنکا اور آنے والے واقعہ کا دھڑکا پیدا ہو گیا، میں نے دہلی آتے ہی پوچھا کہ حضرت شیخ کا مزاج کیسا ہے؟ کوئی تار یا اطلاع ملی؟ ہمارے میزبان حافظ کرامت صاحب نے کہا کہ ابھی کل ہی بھائی سعدی کا ٹیلی فون آیا کہ حالت اطمینان بخش نہیں ہے غشی بھی کبھی کبھی طاری رہتی ہے اور معالجین صحت کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں، پھر میری موجودگی میں گھر کے ٹیلی فون آئے اور معلوم ہوا کہ تشویش قائم ہے اور صحت میں بہتری پیدا نہیں ہوئی۔

خبر صاعقہ اثر

۱۸ مئی کو ہم لوگ لکھنؤ واپس آ گئے، ۲۵ مئی ۱۹۸۲ء ۲ شعبان ۱۴۰۲ھ کو دہلی سے

بذریعہ ٹیلی فون اور مدینہ طیبہ سے مولوی سعید الرحمن ندوی کے تار سے جو اس وقت وہاں موجود تھے حادثۂ فاجعہ کی جانکاہ اطلاع ملی۔

أيتها النفس أجملي جزعا　　إن الذي تحذرين قد وقعا

آخری ایام و ساعات

اب اس کے بعد کی تفصیلات محب گرامی ڈاکٹر اسماعیل صاحب کے مکتوب سے ماخوذ کر کے انہیں کے الفاظ میں درج کی جاتی ہیں، وہ حضرت شیخ کے مخلص و محب خادم اور ہر وقت کے حاضر باش معالج تھے، وہ اپنے اس مکتوب میں جو انھوں نے مخصوص اہل تعلق کو بھیجا ہے لکھتے ہیں:۔

"حضرت اقدس دامت برکاتہم کی علالت کا سلسلہ تو کئی سال سے چل رہا تھا، ۱۰ رمئی چہار شنبہ سے قبل صحت نسبتاً اچھی تھی کھانا بھی نوش فرماتے تھے گفتگو بھی ٹھیک طرح سے فرماتے تھے پوچھنے پر مشورہ بھی حسب سابق دیتے تھے، مولانا عاقل صاحب مسلم شریف کی تقریر کا جو علمی کام کر رہے ہیں، وہ روزانہ کا کام ایک دفعہ حضرت کو سناتے حضرت غور سے سنتے اور ضروری مشورہ بھی دیتے تھے گویا صحت اچھی تھی البتہ ضعف بہت تھا جس کی وجہ سے حرم شریف صرف ایک نماز کے لیے تشریف لے جاتے، شروع میں ظہر کی نماز میں اور پھر دھوپ میں تیزی ہو جانے کی وجہ سے عشاء کی نماز میں حرم شریف جانے کا معمول تھا۔

چہار شنبہ ۱۰ رمئی کو حضرت کو بخار ہوا، ۱۰۰ ڈگری تک ہو گیا، علاج وغیرہ سے بخار تو اتر گیا لیکن ضعف میں بہت اضافہ ہو گیا، اور حرم شریف جانا چھوٹ گیا

استغراق زیادہ رہنے لگا، ۱۳ مئی کو نماز جمعہ حرم شریف کی جماعت کے ساتھ
مدرسۂ علوم شرعیہ کے صدر دروازہ میں ادا فرمائی جہاں تک حرم شریف کی صفوں
کا اتصال رہتا ہے، بخار کے بعد سے کھانا تقریباً چھوٹ گیا، (مشروبات کا)
پینا کسی نہ کسی درجہ میں جاری رہا، جمعہ ۱۳ مئی سے روزانہ صبح وشام گلوکوز
وغیرہ کی بوتلیں رگ میں دی جاتی رہیں جن کا سلسلہ وصال کے دن تک جاری رہا،
دیگر علاج انجکشن وغیرہ بھی دیئے جاتے رہے۔

شنبہ ۱۵ مئی کو آنکھوں میں اور پیشاب میں یرقان محسوس ہوا، خون کا معائنہ
کرایا گیا جس سے جگر اور گردہ میں مرض معلوم ہوا، اور دونوں اعضاء کے عمل میں
خلل کا بھی پتہ چلا، یکشنبہ ۱۶ مئی کی شب میں نیم بے ہوشی تھی، دوسرے دن ظہر سے
مکمل بے ہوشی ہو گئی، اتوار کا سارا دن مکمل بے ہوشی میں گذرا کہ جس کروٹ لٹایا
جاتا اسی پر رہتے، نہ آواز دیتے نہ حرکت، نہ کھانسی وغیرہ، نبض اور بلڈ پریشر دیکھ کر
اطمینان ہوتا کہ فوری خطرہ نہیں ہے، علاج وغیرہ مختلف تدبیریں ہوتی رہیں،
اتوار کی شام کو بخاری شریف کا ختم کرایا گیا، جو اتوار سے پیر دو روز میں مکمل ہوا،
جس کے بعد صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب نے بہت الحاح کے ساتھ دعا کرائی،
مکہ مکرمہ میں شیخ محمد علوی مالکی کے یہاں بھی یٰسین شریف کا ختم ہوا۔

دوشنبہ ۱۷ مئی کو بے ہوشی تو تھی لیکن کل جیسی نہیں تھی، بلکہ نیم بے ہوشی کی کیفیت
تھی، صبح تو "اللہ اللہ" فرماتے رہے، ظہر کے بعد سے "یا کریم یا کریم" یا "او کریم
او کریم" فرماتے رہے، کبھی کبھی "یا علیم یا کریم" بھی فرماتے رہے، یا کریم کی آواز بھی
اخیر وقت تک وقتاً فوقتاً دیتے رہے، علاج کے سلسلہ میں ناکارہ دیگر ڈاکٹروں

سے بھی برابر مشورہ کرتا رہا بالخصوص ڈاکٹر اشرف صاحب، ڈاکٹر ایوب صاحب
ڈاکٹر سلطان صاحب، ڈاکٹر منصور، ڈاکٹر عبدالصمد وغیرہ خون وغیرہ کے
معائنہ کے لئے ڈاکٹر ناصر اصغر صاحب بہت تعاون فرماتے رہے البتہ جگر اور
گردہ کا عمل برابر کمزور ہوتا گیا، خون، پیشاب کا معائنہ اور علاج و دیگر تدابیر
ہوتی رہیں، غذا تقریباً بند تھی، رگ میں بوتلوں کے ذریعہ ہی غذا، پانی، اور گلوکوز
وغیرہ دیا جاتا رہا، ۱۲ مئی کو نماز جمعہ حرم شریف کی جماعت کے ساتھ مدرسہ
کے صدر دروازہ میں ادا فرمائی۔

اتوار ۱۳ مئی کی صبح تک بظاہر طبیعت کچھ ٹھیک رہی، ۱۳ مئی کو بعد ظہر
سوء تنفس کی تکلیف ہوئی جس کی فوری تدبیر کرلی گئی، مغرب سے آدھ گھنٹہ قبل
جب یہ ناکارہ مطب میں تھا حضرت کے خادم مولوی نجیب اللہ نے ٹیلی فون
پر بتلایا کہ حضرت کی طبیعت خراب ہے، چنانچہ میں فوراً حاضر ہوا تو دیکھا کہ
سوء تنفس کی تکلیف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے حضرت کو بے چینی ہے
سانس لینے میں بہت دقت محسوس ہو رہی ہے، بندہ نے معائنہ کرکے ضروری
انجکشن لگائے جس کے چند منٹ کے بعد سکون ہوگیا، اور سانس طبعی حالت پر آگئی
عشاء کے بعد بندہ کے گھر جانے تک طبیعت نسبتاً ٹھیک تھی، ۱۴ مئی فجر کے
وقت بھی طبیعت نسبتاً ٹھیک تھی، اور حضرت گفتگو بھی تھوڑی تھوڑی فرماتے
رہے، البتہ تشویش کی بات یہ پیش آئی کہ کل ظہر کے بعد سے پیشاب بالکل
نہیں آیا، صبح ۸ بجے دوبارہ سوء تنفس کی تکلیف شروع ہوئی، اس کے لئے اور
پیشاب کے لئے تدبیریں کی جانے لگیں جس سے ظہر عصر کے درمیان پیشاب آگیا

تنفس کے لئے انجکشن آکسیجن وغیرہ لگائے گئے، بارہ بجے دوپہر تک یہی حالت رہی، کبھی فرماتے بٹھاؤ، کبھی فرماتے لٹاؤ، کبھی فرماتے دوا لاؤ، وقتاً فوقتاً "یا کریم" اور "کریم" بھی بلند آواز میں فرماتے رہے، یہ ناکارہ چونکہ مسلسل پاس ہی بیٹھا رہا تو کبھی کبھی اس ناکارہ کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیتے تھے، تقریباً گیارہ بجے جبکہ الحاج ابوالحسن نے تکیہ اونچا کیا تو بندہ کی طرف دیکھ کر فرمایا "ڈاکٹر صاحب" ابوالحسن نے کہا "ہاں یہ ڈاکٹر اسماعیل ہیں" یہ سن کر بندہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے یہ آخری گفتگو تھی جو حضرت نے فرمائی۔ اس کے بعد "یا کریم" اور "کریم" فرماتے رہے، ظہر تک یہ کیفیت رہی، ظہر کے بعد سے مکمل سکون ہو گیا، جو آخری وقت تک رہا، یہ ناکارہ بار بار نبض و بلڈ پریشر وغیرہ دیکھتا رہا، روح پرواز کرنے سے کچھ قبل صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب نے بندہ سے پوچھا کہ کیا یہ آخری وقت ہے؟ بندہ نے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے بلند آواز سے اللہ اللہ کہنا شروع کر دیا، اسی حال میں حضرت نے دو مرتبہ آخری ہچکیاں لیں جس سے آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور روح پرواز کر گئی، اس وقت ٹھیک ۵ بج کر ۴۰ منٹ ہوئے تھے یعنی مغرب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اجرنا فی مصیبتنا وعوضنا خیراً منہا وانا بفراقک یا شیخ لمحزونون۔" جس کی ساری عمر اتباع سنت میں گذری اس کو تکوینی طور پر یہ اتباع بھی نصیب ہو گیا کہ دو شنبہ کو عصر مغرب کے درمیان وصال ہوا۔

اس وقت حاضرین کا جو حال تھا، وہ بیان نہیں کیا جا سکتا، وصال کے

وقت پاس موجود ہونے والوں میں صاحبزادہ مولانا محمد طلحہ صاحب،
مولانا عاقل صاحب، ان کے صاحبزادہ جعفر، الحاج ابو الحسن، مولوی
نجیب اللہ، صوفی اقبال، مولانا یوسف تتاولا، حکیم عبد القدوس، مولوی
اسماعیل، مولوی نذیر، ڈاکٹر ایوب، حاجی ولدار، اسعد، عبد القدیر اور ناکارہ
تھے۔ فوراً ہی تجہیز و تکفین کے انتظامات شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر ایوب کو ہسپتال
کا ورقہ لینے کے لئے اسی وقت بھیج دیا گیا تھا۔ صاحبزادہ محمد طلحہ صاحب،
مولانا عاقل صاحب و دیگر متعلقین و خدام کا مشورہ ہوا کہ تدفین عشاء
کے بعد ہو یا فجر کے بعد؟ کیونکہ بعض مخصوص احباب و اعزہ کے مکہ مکرمہ سے
پہونچنے کی اطلاع تھی۔ چونکہ ان کی وہاں سے روانگی کا وقت معلوم تھا،
جس کے پیش نظر ان کا عشاء تک پہونچ جانا گویا یقینی تھا۔ اس پر یہ طے
ہوا کہ عشاء میں ہی نماز جنازہ ہو جانی چاہئے اور فجر تک مؤخر نہ کیا جائے
اس کا اعلان بھی کر دیا گیا، لیکن اس کا بھی بڑا افسوس رہے گا کہ وہ اعزہ
جن کی آمد کا ہمیں شدت سے انتظار تھا، وہ راستہ میں گاڑی خراب ہو جانے
کی وجہ سے بر وقت نہ پہونچ سکے، اور چونکہ عشاء کا اعلان ہو چکا تھا، اس لئے
عین وقت پر تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہر جگہ ٹیلی فون سے اطلاع کر دی گئی۔
سو نو بجے غسل دیا گیا، جو مولانا عاقل صاحب اور مولانا یوسف تتاولا صاحب
کی ہدایات اور مشوروں سے دیا گیا۔ غسل کے وقت خدام کا بڑا مجمع موجود تھا،
ہر شخص کی خواہش تھی کہ اس مبارک عمل میں شریک ہو۔ غسل میں شرکت
کرنے والوں میں یہ حضرات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

* مولانا یوسف متالا، الحاج ابوالحسن، مولوی مجیب اللہ، حکیم عبدالقدوس عزیزی، جعفر شاہ عطاء المہیمن ابن مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری، صوفی اسلم مولوی صدیق، مولوی احسان، قاضی ابرار، عبدالمجید وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد ایوب جو ورقہ لینے گئے تھے، پونے دو گھنٹے کے بعد آئے اور بتلایا کہ ورقہ حاصل کرنے میں کچھ قانونی رکاوٹ ہو رہی ہے، اور حضرت مولانا ظلو صاحب کا جانا ضروری ہے، چنانچہ مولانا ظلو صاحب کو بھی ان کے ہمراہ بھیجا گیا، قبرستان والوں سے قبر کھودنے کو کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ جب تک ہسپتال کا ورقہ نہ آجائے، ہم قبر نہیں کھود سکتے، اس وقت عشاء میں صرف پون گھنٹہ باقی تھا، دوبارہ مندرجہ بالا حضرات نے مشورہ کیا کہ اب بظاہر عشاء تک قبر تیار ہونا دشوار ہے لہٰذا فجر میں جنازہ ہو، اس کے فوراً بعد سید حبیب صاحب تشریف لائے، انھوں نے فرمایا کہ میں خود جاکر قبر کی جگہ متعین کرآیا ہوں، اور قبر کھودنا شروع ہوگیا ہے، تقریباً بیس منٹ بعد اسپتال کا ورقہ بھی آگیا، اور قبر تیار ہوجانے کی اطلاع بھی مل گئی، نیز قبرستان والے مخصوص چارپائی بھی لے آئے، گویا عشاء کی اذان سے پندرہ منٹ قبل جنازہ بالکل تیار تھا، لہٰذا پہلے مشورہ کے مطابق جنازہ باب السلام سے حرم شریف لے جایا گیا، عشاء کے فرضوں کے متصل بعد یہاں کی عام روایت کے مطابق حرم شریف کے امام شیخ عبداللہ زاحم نے نماز جنازہ پڑھائی، اور جنت البقیع کی طرف باب جبرئیل سے نکل کر چلے، ہجوم بے پناہ تھا، ایسا ہجوم کسی اور کے جنازہ میں

شاید ہی دیکھا گیا ہو۔ قبر شریف حضرت کی منشاء کے مطابق اہل بیت کے احاطہ اور حضرت سہارنپوری کی قبر شریف کے قریب کھودی گئی تھی صاحبزادہ مولانا طلحہ اور الحاج ابوالحسن قبر شریف کے اندر اترے اور اس کو بند کیا اس طرح حضرت اقدس کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی۔

ایک خاص بات یہ دیکھی کہ وصال سے ایک روز قبل حضرت والا ہر ایک سے فرداً فرداً دریافت فرماتے ہیں کہ تم کیا کام کرتے ہو؟ صوفی اقبال صاحب عزیزم ابوالحسن صاحب اس ناکارہ سے براہ راست دریافت فرمایا، صاحبزادہ مولانا طلحہ دوسرے کمرے میں تھے تو خادم کو بھیجا کر طلحہ سے پوچھ کر آ کہ تو کیا کام کرے ہے؟ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ پڑھنے ذکر تلاوت وغیرہ کا جواب دیا، تو سکوت فرمایا، بندہ سے دریافت فرمایا تو بندہ سے قبل ابوالحسن نے جواب دیا کہ یہ تو ابھی مطب جا کر مریضوں کا علاج کر رہے تھے تو فرمایا "یہ بھی کوئی کام ہے" گویا آخری وقت تک بھی اپنے لوگوں کے متعلق فکر تھا کہ کیا کرتے ہیں۔

تدفین کے بعد حضرت نور اللہ مرقدہ کے ایک مجاز نے دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے:۔ "فتحت له ابواب الجنة الثمانية" یعنی ان کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے گئے۔

ایک اور صاحب نے دوسرے روز صبح روضۂ اقدس پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہوئے محسوس کیا گویا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں تمہارے شیخ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دی گئی ہے۔ ایسا انسان لاکھوں کروڑوں

جذبؔ شاہ کربلا کی یاد میں روتا رہوں
خون دل کا سیل ہو اور غرق میں ہوتا رہوں

اے خدائے دو جہاں اے مالک عرش عظیم
اے کریم کارساز اے رب رحمٰن و رحیم

رحم تیرا بے کراں ہے فضل تیرا بے حساب
بخش دے جذبؔی کو بھی کچھ درد و سوز و اضطراب

حلیہ اور پسماندگان

شیخ بڑے حسین و جمیل تھے، حسن و جمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خصوصی وجاہت بھی عطا فرمائی تھی، رنگ سرخ سپید، چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا، جسم گداز، فربہی مائل، قد میانہ، جب عربی شملہ پہن لیتے اور عمامہ باندھ لیتے تو ہزاروں میں ممتاز نظر آتے، مجھے یاد ہے کہ سیوان کے ایک جلسہ (رضا بالب کے جلسہ میں) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے ان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھ سے فرمایا کہ "شیخ بڑے شاندار آدمی ہیں"۔ آخر میں بیماریوں نے نقاہت پیدا کر دی تھی، پھر بھی چہرہ ویسا ہی دمکتا ہوا نظر آتا تھا، اور قلب و دماغ دونوں بیدار۔

حضرت شیخ نے اپنے پسماندگان میں[1] اہلیہ محترمہ، ایک صاحبزادہ مولوی محمد طلحہ صاحب اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑیں، جن کی ضروری تفصیل یہ ہے:

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا الحاج انعام الحسن صاحب زاد مجدہ، ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ (ستمبر ۱۹۱۲ء) میں ان کی پیدائش ہوئی، حضرت نور اللہ مرقدہ اس وقت حضرت سہارنپوری

---

[1] پسماندگان اور ان صاحبزادگان و دختران کی جن کی حضرت شیخ کی حیات میں وفات ہوگئی تفصیل اور تذکرہ مصنف کی درخواست پر حضرت کے نواسے مولانا محمد شاہد صاحب نے تحریر کیا ہے جو ضمیمہ کی ترتیب کے بعد شائع کیا جائے گا۔

نور اللہ مرقدہ کے ساتھ اپنے پہلے سفرِ حجاز پر تشریف لے جا چکے تھے ۳ محرم ۱۳۵۴ھ (۷ اپریل ۱۹۳۵ء) میں آپ کا نکاح ہوا، مولوی محمد زبیر سلمہٗ آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب: ۱۳۴۴ھ میں ان کی ولادت ہوئی ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ (۲۳ اپریل ۱۹۳۶ء) میں موصوفہ کی شادی مولوی سعید الرحمٰن ابن مولانا الحبیب الرحمٰن صاحب کاندھلوی سے ہوئی، ۱۹ شوال ۱۳۶۲ھ میں مولوی سعید الرحمٰن کا انتقال ہوا، بعد ازاں موصوفہ کا دوسرا نکاح ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ (۷ فروری ۱۹۵۰ء) بحیاتِ شیخ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ہوا، کوئی اولاد آپ کے نہیں ہے۔

اہلیہ محترمہ مولانا الحاج حکیم محمد الیاس صاحب فرزند مولانا حکیم محمد ایوب صاحب: ۵ ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ (۱۹ مارچ ۱۹۳۸ء) میں آپ کی ولادت ہوئی، ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ بحیاتِ شیخ آپ کا نکاح بعبارۃ حضرت مدنی بمہرِ فاطمی ہوا، مولوی محمد شاہد، حافظ محمد راشد، حافظ محمد سہیل اور محمد سعد سلمہم کی والدہ ہیں۔

مولوی محمد طلحہ صاحب سلمہٗ آپ، زوجہ محترمہ ثانیہ سے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ (۲۸ مئی ۱۹۴۱ء) شنبہ کے روز پیدا ہوئے، ابتداءً قرآن پاک حفظ کیا جس کا ختم ۲۹ رجب ۱۳۶۵ھ میں حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری کی مجلس مبارک میں ہوا، ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ (۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء) میں سہارنپور میں فارسی تعلیم کا آغاز ہوا، ۳ شعبان ۱۳۷۲ھ میں فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کی ابتدائی تعلیم کے لئے نظام الدین گئے، وہاں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کرکے ۱۳۷۸ھ میں واپس سہارنپور آئے اور جامعہ مظاہر علوم میں داخلہ لے کر شرح جامی، ہدایہ اولین، مقامات حریری

وغیرہ پڑھیں، دورۂ حدیث آپ نے ۱۳۸۷ھ میں مدرسہ کاشف العلوم میں پڑھا، بخاری شریف آپ نے حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ اور طحاوی حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ ترمذی و مسلم مولانا عبید اللہ صاحبؒ ابوداؤد شریف مولانا اظہار الحسن صاحبؒ پڑھی ہے۔

دینی تعلیم سے فراغت پاکر حضرت رائے پوری سے بیعت ہوئے اور پھر اپنے والد ماجد مخدوم الکل کی سرپرستی میں رہ کر ذکر و شغل میں مستعدی کے ساتھ مصروف ہوئے ماہ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اجازت بیعت مرحمت فرمائی، حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد شوال ۱۴۰۲ھ ـــ میں ان کی جگہ مظاہر علوم کے سرپرست بنائے گئے۔

اہلیہ محترمہ مولانا محمد عاقل (ابن مولانا حکیم محمد ایوب صاحب) یہ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی دوسری اہلیہ محترمہ کے بطن سے پہلی صاحبزادی ہیں ـــــ ۶ رمضان ۱۳۶۳ھ (۲۵ر جولائی ۱۹۴۴ء) میں پیدا ہوئیں ۸ ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ (۱۹ ستمبر ۱۹۶۱ء) میں آپ کا نکاح ہوا حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی شرکت کے خیال سے اس نکاح کی مجلس رائے پور میں منعقد ہوئی حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے مہر فاطمی پر نکاح پڑھایا، حافظ محمد جعفر سلمہٗ، حافظ محمد عمیر، محمد عادل، محمد عاصم سلمہم کی آپ اولاد ہیں۔

اہلیہ محترمہ مولانا محمد سلمان صاحب (ابن مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب) ۲۹ صفر ۱۳۸۰ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی، ۳۰ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ (۳ر فروری ۱۹۷۶ء) میں بعبارۃ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب مہر فاطمی پر آپ کا نکاح ہوا، حافظ محمد عثمان حافظ محمد نعمان سلمہا آپ کی اولاد ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سب واماد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب، مولانا حکیم محمد الیاس صاحب، مولانا محمد عاقل صاحب مولانا محمد سلمان صاحب جید عالم، صاحب درس و افادہ اور صاحب تصنیف ہیں۔ مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا انعام الحسن صاحب کے متعلق تو کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اول الذکر کی مساعی جمیلہ اور کمالات و ہمتیہ عالم آشکارا ہیں اور آپ کے تذکرہ میں ایک پوری ضخیم کتاب "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی" (تالیف مولوی سید محمد ثانی حسنی مرحوم) موجود ہے اور ثانی الذکر (بارک اللہ فی حیاتہ ومساعیہ) کی ذات جماعت تبلیغ کی امیر اور اس کی عالمی تحریک وجدوجہد کی سرپرست ونگراں ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحب مظاہر العلوم کے ممتاز فضلاء میں ہیں، شعبان ۱۳۶۱ھ میں فراغت پائی، بخاری شریف آپ نے حضرت شیخ سے پڑھی، اور ایک علمی ودینی ادارہ کتب خانہ اشاعت العلوم کے نام سے قائم کیا جس کے ذریعہ بہت سی دینی کتابیں اور حضرت شیخ کی متعدد نادر تصنیفات منظر عام پر آئیں، شیخ کی مشہور ومعروف تصنیفات "لامع الدراری" "اوجز المسالک" اور "الکوکب الدری" وغیرہ کے اولین ایڈیشن آپ کے ہی توسط سے دہلی سے شائع ہوئے۔

آپ کے دوسرے خویش مولانا محمد عاقل صاحب نے ۱۳۸۶ھ میں مظاہر العلوم سے فراغت حاصل کی، بخاری شریف حضرت شیخ سے پڑھی، ذہانت وفطانت اور بلند پایہ علمی استعداد کے مالک ہیں، ۱۳۸۸ھ میں مظاہر العلوم کے استاد منتخب ہوئے ۱۳۸۸ھ میں دورۂ حدیث کے اساتذہ میں کرپہلی مرتبہ ابوداؤد شریف

پڑھائی، اس وقت سے ابوداؤد کا درس آپ ہی سے متعلق ہے، شیخ کی جانب سے آپ کو اجازت بیعت بھی ہے، آپ شیخ کے تصنیفی و تالیفی سلسلہ میں معاون رہے ہیں "الکوکب الدری علی جامع الترمذی" پر آپ کا ایک طویل مقدمہ ہے جو ۱۳۹۵ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا محمد سلمان صاحب نے ۱۳۸۲ھ میں دورۂ حدیث پڑھا، درس بخاری میں شیخ کے یہاں اکثر و بیشتر آپ ہی قراءت کرتے تھے، شوال ۱۳۸۵ھ میں تدریس کا آغاز کیا، ۱۳۹۳ھ میں اساتذۂ حدیث کے سلک میں منسلک ہوئے، مشکوۃ شریف کا درس آپ ہی سے متعلق ہے، شیخ کی عربی تصنیفات و تالیفات کی تکمیل و ترتیب میں مولانا محمد عاقل صاحب اور مولانا محمد سلمان صاحب رفیق و شریک رہے، رمضان میں شیخ کی مجلس اعتکاف میں قرآن مجید سنانے کی ذمہ داری آپ نے بڑی مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی۔

حضرت شیخ کے سب نواسے بھی جو سن بلوغ کو پہنچ چکے ہیں، اور تکمیل علوم کر چکے ہیں، ماشاء اللہ عالم و فاضل اور علمی و دینی خدمت میں مشغول و منہمک ہیں، ان میں آپ کے نواسے اور مولانا حکیم محمد الیاس صاحب کے صاحبزادہ مولانا محمد شاہد صاحب مظاہری ممتاز ہیں، وہ جید عالم، رواں قلم مصنف اور علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والے نوجوان فاضل ہیں، "مکتوبات علمیہ" اور "علمائے مظاہر علوم اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات" اور "تاریخ مظاہر علوم" (جلد دوم) وغیرہ ان کے تصنیفی ذوق اور قلم کی روانی کے شاہد ہیں، حضرت شیخ کی ان پر خاص شفقت تھی، اور انہیں کی توجہ اور محنت سے شیخ کے کئی قلمی مسودات اور خطوط کے مجموعے منظر عام پر آئے۔

آپ کے دوسرے نواسے مولوی محمد زبیر صاحب ابن مولانا انعام الحسن صاحب بھی مظاہر العلوم کے فاضل ہیں، تکمیل کے بعد حضرت شیخ کے زیر ہدایت و تربیت ذکر و شغل میں مصروف رہے، اور شیخ نے ان کو مدینہ منورہ میں اجازت بھی مرحمت فرمائی، وہ اپنے والد ماجد کے زیر سایہ مرکز تبلیغ نظام الدین میں دعوت و تبلیغ اور وہاں کے مدرسہ کاشف العلوم میں درس و تدریس میں مصروف ہیں، بارك الله في حياته۔

دوسرے خوردسال نواسے حفظ قرآن کی سعادت سے بہرہ ور، اور تحصیل و تکمیل علم میں مشغول ہیں، جن میں حافظ محمد جعفر سلمہٗ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو حضرت شیخ کے آخری سفر حجاز میں ہمرکاب اور مدینہ منورہ کے آخری قیام میں حاضر باش رہے، بارك الله في حياتهم۔

حضرتؒ کی حیات میں آپ کی جو اولاد ذخیرۂ آخرت بنی وہ یہ ہے۔

صاحبزادی زکیہ مرحومہ۔ ۲۷ شعبان ۱۳۳۷ھ (۸ مئی ۱۹۱۹ء) شب دوشنبہ میں تولد ہوئیں، یہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی سب سے پہلی صاحبزادی تھیں، ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۴ھ (۱۰ اپریل ۱۹۳۵ء) میں مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ان کا نکاح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ ہوا، ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ (۲ جون ۱۹۳۶ء) کو بعد عصر رخصتی ہوئی، طویل عرصہ تک تپ دق میں مبتلا رہ کر ۲۹ شوال ۱۳۶۵ھ (۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء) بروز دوشنبہ مغرب کی نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کی حالت میں انتقال ہوا، مولانا محمد ہارون صاحب مرحوم آپ ہی کے بطن سے تھے۔

محمد موسیٰ۔ رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی، تقریباً سات آٹھ ماہ

حیات رہ کر ۹ ربیع الثانی سنہ [illegible] میں انتقال ہوا۔

صاحبزادی شاکرہ مرحومہ۔ یہ حضرت کی تیسری صاحبزادی تھیں ماہ صفر سنہ [illegible]
میں پیدا ہوئیں اپنے ایک خاندانی عزیز مولوی احمد حسن کاندھلوی سے ۱۹ جمادی الاول [illegible]
(۲۶ اپریل [illegible]) یوم دوشنبہ میں نکاح ہوا۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے مہر فاطمی پر
نکاح پڑھایا، ۱۸ رجب [illegible] (یکم مئی [illegible]) دوشنبہ میں وفات ہوئی، حادثۂ انتقال
کی کیفیت حضرت شیخ اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"اتفاق سے مولانا یوسف صاحب سہارنپور آئے ہوئے تھے، میں بھی ان کے ساتھ
گھر میں گیا تو مرحومہ نے یٰس شریف پڑھنے کی فرمائش کی، مولانا یوسف صاحب نے
پڑھی اور جب سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ پر پہنچے تو نہ معلوم مولانا یوسف صاحب مرحوم پر
ایک جذبہ اور جوش آیا اور اس آیت شریفہ کو تین دفعہ پڑھا، تیسری کے درمیان میں میری
مرحومہ بچی کی روح پرواز کر گئی۔"

محمد ہارون۔ رجب [illegible] میں ان کی ولادت ہوئی، مختصر سی عمر میں انتقال
ہو گیا تھا۔

خالدہ مرحومہ۔ ۲۸ ذی الحجہ [illegible] میں تولد ہوئیں، بچپن میں ہی انتقال ہو گیا۔

محمد یحییٰ۔ ۲ جمادی الثانی سنہ [illegible] میں پیدا ہوئے اور کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔

صفیہ۔ یہ پہلی زوجہ مرحومہ سے آخری اولاد ہے، ان کی ولادت ذی الحجہ [illegible]
میں ہوئی، ایک سال بعد ۱۰ محرم سنہ [illegible] میں ان کا انتقال ہوا۔

عبد الحئی۔ یہ دوسری اہلیہ محترمہ سے پہلے صاحبزادے ہیں، ۱۸ ربیع الثانی [illegible]
میں دہلی میں پیدا ہوئے، تقریباً ایک ماہ حیات رہ کر ۱۸ جمادی الاولیٰ میں وفات ہوئی،

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ اپنے مشاغل عالیہ کی وجہ سے نہ خبرِ ولادت پر دہلی پہنچ سکے اور نہ خبرِ وفات پر۔

حضرت کی ایک ہی ہمشیرہ تھیں جن کا نام عائشہ خاتون تھا، ان کی شادی ۷ صفر ۱۳۳۷ھ (۱۳ نومبر ۱۹۱۸ء) میں جناب ماموں شعیب صاحب سے ہوئی تھی، ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ (۱۵ دسمبر ۱۹۴۰ء) میں کاندھلہ میں ان کا انتقال ہوا، عمر تقریباً چالیس سال ہوئی، ان سے ایک لڑکی یادگار رہیں، جو مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب کی اہلیہ محترمہ (یعنی والدہ مولوی محمد سلمان و والدہ مولوی محمد خالد سلمہما) ہیں۔

مولوی محمد طلحہ صاحب

صاحبزادہ عزیز گرامی قدر مولوی محمد طلحہ شیخ کی زندگی ہی میں حافظ و عالم، ذاکر، شاغل اور صاحب اجازت ہو گئے، ان پر شروع سے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کی خاص نگاہ شفقت تھی، اور بعض اوقات حضرت نے ان کی خاطر اپنے سفر کا پروگرام ملتوی فرما دیا، اور فرمایا کہ "طلحہ نے مجھے روک لیا" ویسے بھی تمام معاصر بزرگوں اور شیخ کے یہاں آنے جانے والے صلحاء و علماء کی ان پر نظر خاص رہی، اللہ تعالیٰ نے ان کو انتظامی صلاحیت، توازن و اعتدال، تواضع اور خدمت کا جذبہ اور اصابت رائے کا جوہر عطا فرمایا جو ان کی پدری میراث بھی ہے، حضرت شیخ کے سہارنپور میں رمضان گزارنے کے آخر میں وہی بڑے محرک تھے، شیخ سے تعلق رکھنے والوں اور جن سے شیخ کو تعلق تھا، کے مراتب وہ دوسروں سے زیادہ پہچانتے ہیں، اور اسی کے مطابق ان سے معاملہ کرتے ہیں، شیخ نے ان کی خصوصی تربیت فرمائی، اور امکانی حد تک ان کے اندر صاحبزادگی اور محبوبیت کی

نہیں پیدا ہونے دی ۔ اسی لئے ان کے دوروں اور شیخ کے اہل تعلق میں جانے کو ہمیشہ ناپسند کرتے رہے ۔ اور وہ خود بھی اس سے محترز رہے ۔ شیخ کے آخری زمانۂ قیام مدینہ میں اللہ تعالے نے مع والدہ صاحبہ کے ان کو حضرت شیخ کے پاس پہونچا دیا ، اور ان کو خدمت کا پورا موقع دیا ، شیخ کی وفات پر انھوں نے اسی صبر و تحمل اور وقار و سکینت کا مظاہرہ کیا ، اور دوسروں کے لئے باعث تقویت و تسلی بنے ، جیسے خود حضرت شیخ اپنی زندگی میں تعزیت کرنے والوں کے لئے بن جاتے تھے " أطال اللّٰه حياته ونفع به المسلمين "

باب نہم

خداداد کمالات، یگانہ مزاجی وطبعی خصوصیات

چند اہم خصوصیات وکمالات

کسی ایسی ہستی کی خصوصیات اور کمالات کو لکھنا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اجتبائی معاملہ ہوا اور جس کو مدارج عالیہ سے نوازا گیا ہو نہ صرف دشوار بلکہ قریب ناممکن ہے کہ روحانی کمالات باطنی کیفیات، اور عبد ومعبود کے معاملات کا صحیح علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا ہے۔

کرا ناکا تبین راہم خبر نیست

لیکن جو نمایاں پہلو کوتاہ نظروں اور کم نگاہوں کو بھی نظر آجاتے ہیں ان کے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں نہایت اختصار کے ساتھ یہ سطریں قلم بند کی جارہی ہیں۔

علوئے استعداد وعلوئے ہمت

شیخ کی سب سے زیادہ نمایاں صفت، اور اقران ومعاصرین میں ان کا امتیاز، وہ عالی جوہر بلند استعداد اور بلند ہمت ہے جو ان کے حصہ میں آئی۔ ان کی اس علوئے استعداد کی شہادت بڑے بڑے اہل نظر نے دی ہے اور اس کے بغیر یہ ترقیات اور کمالات

جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرہ مند کیا ہے ممکن نہیں، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار حضرت شیخؒ اور مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "ہماری جہاں انتہا ہوتی ہے وہاں سے تم لوگوں کی ابتدا ہوتی ہے" کبھی کبھی فرماتے تھے کہ ان چچا بھتیجہ (مولانا محمد الیاس صاحب اور شیخ الحدیث) کی بات ہی الگ ہے" ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت گنگوہیؒ کی نسبت شیخ الحدیث کی طرف منتقل ہوئی" مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ کے ساتھ اپنے ایک خورد اور فرزند کا سا معاملہ جتنا فرماتے اس سے زیادہ ایک بزرگ اور بلند مرتبت شیخ کا سا معاملہ فرماتے، اس کا کچھ اندازہ اس خط سے ہوگا جو خوش قسمتی سے راقم سطور کے پاس محفوظ ہے اور خلاف معمول مولانا ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے:۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اپنے ساتھ آپ کا حسن ظن خوش قسمتی اور منداللہ بڑی امیدوں کا باعث جانتا ہوں، اللہ تعالیٰ شانہ خوش رکھیں اور اپنے ساتھ صادق وصادق یکسوئی و للہیت کے ساتھ نسبت محمدیہ مرضیہ روزی فرمائیں، آمین ثم آمین

دل خواہاں تھا کہ رمضان مبارک میں تمہارے قریب خلوت اندوز ہوتا، مگر تمہیں اپنی ولایتی جس طرح اصول ہو اس کی پابندی مناسب ہے، تم جیسے عالی ہمت کے لئے اپنی دنیا ان کا روڑا ہو جانا تو طلب قبول نہیں کرتا، مگر ان شاء اللہ مناسب وہی ہوگا جس طرف طبیعت مائل ہو اسباب ظاہری کچھ بھی ہوں۔

رمضان مبارک میں بندہ بھی دعوات کا خواہاں ہے، بھولیں نہیں، بندہ کے لئے تمہاری ذات ان شاء اللہ سرمایہ دارین ہے، تو دعا دل و جان سے نکلنی ضروری ہے مگر افسوس خدا جانے دل و جان کس حاشیہ میں ہیں کچھ پتہ نہیں، اللہم ارحم الخ

گھر میں سب کو دعوات۔

عزیزی حکیم ایوب کو سلام کے بعد فرما دیں کہ ہمت کریں غفلت نہ کریں آپ

اچھا ورد وظیفہ رمضانیہ تحریر فرمائیں فقط والسلام۔ بندہ محمد الیاس عفی عنہ

۲۳ فروری ۴۴ء

بلند ہمتی و عالی حوصلگی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد شیخ کی زندگی کا سارا محور گھومتا ہے ان کے خمیر میں علوئے ہمت اور فراخیٔ حوصلہ کا جوہر تھا، علم و تصنیف کا میدان ہو یا عبادت و قرب الٰہی کا، خدمت و مہمان داری کا ہو یا زہد و توکل کا، ہر جگہ ان کی بلند ہمتی کے جوہر عیاں تھے، مال و دولت کو انھوں نے کبھی قابل توجہ اور قابل التفات نہیں سمجھا، بیش قرار تنخواہوں اور زریں موقعوں کے ٹھکرا دینے کے متعدد واقعات گزر چکے ہیں، کاندھلہ کی ایک بڑی آبائی جائداد سے جو تھوڑی سی کوشش سے حاصل ہو سکتی تھی، یکسر صرف نظر کر لیا اور ہمیشہ کے لئے اس کا خیال بھی دل سے نکال دیا کہ میرے پاس اس کے حصول کی کوشش کے لئے نہ وقت ہے نہ موقع، اس عالی ہمتی کا ثمرہ ہے کہ اپنے خاص عزیزوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے بے تکلف قرض لے لیتے تھے، مولانا محمد یوسف صاحب کے [illegible] کے موقع پر جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی وفات کے بعد مع اہل و عیال وارد ہونے والا تھا، چالیس ہزار کی رقم قرض لے کر دیا فرما دی[1]، اس کا نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی ساٹھ ستر ہزار

---

[1] حضرت شیخ کا یہ ساز و سامان مولانا محمد یوسف صاحب جیسے قریب ترین عزیز و محبوب بھائی کے ساتھ ہی نہ تھا ان کی عالی حوصلگی اور بلند نظری دوسرے نیازمندوں کے ساتھ بھی تھی میرے بیرونی اسفار خصوصاً حجاز کے سفر کے بارے میں بعض اوقات کا ذکر پہلے آ چکا ہے، ایک مرتبہ ایسے ہی ایک موقع پر آیا تو حضرت شیخ نے مجھے حجاز سے لکھا کہ میں پیش کش کرتی ہوں کہ آپ کے ارادہ کے لئے کسی امیر الامراء یا ملک الملوک کی [illegible]

(باقی ص ۱۹۶ پر)

تک قرض کی مقدار پہونچ گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے برابر اس بار کو ہلکا کرتا رہتا ہے اور غیب سے سامان پیدا فرماتا رہتا ہے۔

اس علوئے ہمت وایثار کا ایک حیرت انگیز واقعہ جو اس زمانہ کے لحاظ سے ناقابل قیاس اور بہت سے لوگوں کے لئے ناقابل یقین ہوگا، یہ ہے ایک ایسے بزرگ عالم کے انتقال پر جن کے ساتھ طویل عرصہ کام کیا تھا اور جن سے کچھ تلمذ کا رشتہ بھی تھا جب ان کے ترکہ کی تقسیم اور قرض کے تصفیہ کے لئے ان کے ورثا اور اہل تعلق جمع ہوئے تو ورثا نے قرض کی ادائیگی کا ذمہ لینے سے جو غالباً پانچ ہزار کی مقدار میں تھا، صاف معذرت کردی، شیخ نے بے تکلف اس قرض کو اپنے ذمہ لے لیا، اور ادا فرمایا۔

مہمانوں کی کثرت، مصارف کی زیادتی، آنے جانے والوں کے ہجوم، افکار وتردداتمیں روز افزوں ترقی، پے درپے جانکاہ حادثات، اور جان سے زیادہ عزیزوں اور بزرگوں کی وفات کے داغ، خاص طور پر شفیق چچا مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور محبوب وباعث فخر بھائی وداماد مولانا محمد یوسف صاحب کی اچانک رحلت، وہ صدمے ہیں جن کا برداشت کرلے جانا، اور اس سب کے باوجود زندگی کے معمولات، طبیعت کی شگفتگی، اور مہمانوں کے حقوق کی ادائیگی میں فرق نہ آنے دینا، غیر معمولی استعداد اور ہمت خداداد کے بغیر ممکن نہیں۔

شیخ کا زہد وتوکل بھی اسی علوئے ہمت کا ایک کرشمہ تھا، انھوں نے اسباب دنیا کی

(بقیہ حاشیہ) ضرورت ہو تو ایک دو مہینے کے لئے ایک حقیر رقم پیش کرتا ہے اگر قبول ہو جائے تو رسمی نہیں ہے اور یہ آپ کو خوب معلوم ہوگا انشاء اللہ رسوم اور ظاہر داری سے کم از کم میں اپنے آپ کو بالاتر سمجھتا ہوں۔ (مکتوب ۲ رشعبان ۸۲ھ ربیع الثانی ۸۳ھ)

فراہمی کی طرف کبھی از خود توجہ نہیں فرمائی، کرایہ کے اس مکان میں رہنا شروع کیا جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہاں کا مکین زندہ نہیں رہتا چنانچہ پے در پے تین موتیں ہوئیں پہلے والد صاحب پھر والدہ پھر چھوٹے بھائی نے قضا کی، لیکن شیخ نے اس مکان سے جنبش نہ کی کبھی اس کو خریدنے کا خیال نہ تھا لیکن اسباب غیب سے ایسے پیدا ہوتے چلے گئے کہ مکان خریدنا پڑا، گھر نیم خام نیم پختہ تھا، باہر مردانہ میں بیٹھنے کے لئے اور زنانخانہ میں رہنے کے لئے بہت کم گنجائش تھی، بہت سے مخلصین نے توسیع کی طرف متوجہ کیا اور مشورہ دیا کہ مکان میں اضافہ اور مرمت کرادی جائے، عمر کی بے ثباتی کا حوالہ دے کر ہمیشہ معذرت کی، باہر کے جس کمرے میں قیام تھا، اس کی چھت کہنہ اور شکستہ تھی، عرصہ تک ایک ستون کے ذریعہ اس کو روکا گیا، بالآخر ان کے منتظم کار مولوی نصیر الدین صاحب نے ان کے رائے پور کے قیام سے ایک مرتبہ فائدہ اٹھایا، حضرت رائے پوری کو لکھ دیا کہ یہیں مکان میں کام لگا رہا ہوں آپ شیخ کو ایک ہفتہ کے لئے مزید روک لیجئے حضرت نے بہانوں سے روک لیا، اور کمرہ کو پختہ کرادیا گیا، ایک پختہ چھجہ بھی بارش سے حفاظت اور آراستگی کے لئے بنادیا گیا، شیخ واپس آئے تو اس چھجہ کی تعمیر پر بہت ناراض ہوئے اور اس کو فضول اور اسراف قرار دے کر خود توڑ ڈالا، اور اس کی جگہ وہی پرانا ٹین کا سائبان لگادیا گیا، جب مہمانوں کی کسی طرح سے گنجائش نہ رہی تو اس کمرہ کے بالمقابل خدام نے ایک مسقف حصہ بنادیا جس میں عام طور پر دوپہر کو کھانا ہوتا تھا۔

اپنے لباس اور اسباب خانہ داری کے بارے میں اور تمام ذاتی معاملات میں اسی قناعت، زہد و توکل، بے اعتنائی اور وارستہ مزاجی سے کام لیتے تھے اور تلاش کرنے والے کو کہیں کوئی سامان تجمل یا اہتمام نظر نہیں آتا تھا۔

جامعیت

اللہ تعالیٰ نے شیخ کے ذات و مزاج کو عجیب و غریب جامعیت عطا فرمائی تھی جس نے بارہا پیشِ آتش و شیشہ و آہن کو جمع کر کے دکھایا۔ طبعی یکسوئی اور فطری خلوت پسندی کے ساتھ مختلف النوع مہمانوں کے حقوقِ ضیافت کی ادائیگی اور ان کا اکرام و اہتمام، علم و عمل کے تقاضوں کو باہم جمع کرنا، نہ صرف مختلف المذاق بلکہ متقابل مسلکوں اور مختلف تحریکات اور مشاغل کے حاملین سے بیک وقت عقیدت و محبت، اعتراف و اقرار، حمایت و دفاع کا تعلق رکھنا اور ان سب کا بیک وقت معتمد علیہ ہونا ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں بہت کم لوگ شیخ کے شریک و سہیم ہوں گے، کانگریس اور لیگ کے شدید اختلافات اور تھانہ بھون اور دیوبند کے تعدد کے دور میں بھی وہ دونوں جگہ یکساں محترم اور محبوب رہے اور ان کی ذات ان تمام تنازعات اور کشمکشوں سے الگ تھلگ رہی، حضرت رائے پوری اور ان کے خدام کی جماعت احرار اور اس کے سرگروہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم، اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم اسی طرح ان کے گھر کو اپنا گھر اور ان کی ذات کو اپنا خیر خواہ، دعا گو اور مخلص سمجھتے ہیں جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ اور حضرت تھانویؒ کے خلفاء و مریدین۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ساتھ ان کو جو خصوصی تعلق و محبت اور اسی کے ساتھ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ساتھ ان کی جو عقیدت و عظمت اس پورے دورِ اختلافات میں رہی، وہ کسی جاننے والے سے پوشیدہ نہیں، ان کی تصنیف "الاعتدال فی مراتب الرجال" ان کے اس ذوق اس جامعیت اور

اس توسط واعتدال کا آئینہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا تھا اور جس نے بارہا ان دینی گروہوں میں جو سب کے سب ایک ہی مرکز و ایک ہی مسلک سے وابستہ تھے وصل واتحاد کا بہت کام انجام دیا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف مذاق کے لوگ اور مختلف مشائخ سے تعلق رکھنے والے اپنی علمی وعملی مشکلات کی الجھنوں کے موقعوں پر شیخ کی طرف رجوع کرتے اور ان کو اطمینان بخش اور فیصلہ کن جواب ملتا۔

سوز وگداز و محبت اور خود انکاری و تواضع

شیخ کے علم، تصنیفی انہماک، وقار و سکینت اور ضبط و تحمل کے فانوس میں عشق و محبت کا ایک ایسا شعلہ تھا جو جانے والوں کی نگاہوں سے مستور نہیں، ان کا خمیر عشق و محبت کے اس جوہر کے ساتھ گوندھا گیا تھا، اور وہ شاید ان کے خمیر کے تمام اجزاء اور عناصر سے زیادہ مقدار میں تھا، ان کا حال وہ تھا جو سوداؔ نے اپنے شعر میں بیان کیا ہے ؎

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا\
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

عشق و محبت کے اس جوہر کا اندازہ اس وقت ہوتا اور اس کے شرارے اسی وقت نظر آتے جب عشق الٰہی، ذات رسالت پناہی اور واصلان بارگاہ الٰہی کا تذکرہ ہوتا، راقم سطور نے اپنے پہلے سفر حجاز کے موقعہ پر مدینہ طیبہ سے ایک خط لکھا جس میں مدینہ کے راستہ کی کیفیات اور بعض نعتیہ اشعار تھے، جب یہ خط پہنچا تو شیخ کی عجب کیفیت تھی، جو لوگ پاس موجود تھے ان کا بیان ہے کہ ایک عزیز خادم[1] سے جو خوش الحان بھی تھے ان اشعار کو ترنم

---

[1] مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی مرحوم مراد ہیں۔

کے ساتھ پڑھنے کی فرمائش ہوئی، گرمی کا زمانہ تھا، رمضان کے ایام تھے، اعتکاف کا موقع تھا، اس وقت کچھ لوگ شیخ کا بدن دبا رہے تھے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جس وقت ان صاحب نے یہ اشعار پڑھے اس وقت شیخ فرط شوق اور شدت جوش میں بالشت بالشت بھر اچھل جاتے جو لوگ بدن دبا رہے تھے ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ شیخ کے جسم میں ایک بجلی سی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اپنی کیفیت کو کسی طرح چھپا نہیں سکتے، راقم سطور نے خود بار ہا دیکھا کہ وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حالات اپنے ایک سودہ سے[1] حضرت رائے پوری کو سنا رہا ہے، شیخ پاس کی چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے ان پر گریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ چارپائی ہلنے لگی، مولانا محمد یوسف صاحب کی معیت میں جو حج ہوا اسی سے واپسی کے موقع پر اس طرح بلک بلک کر رونے لگے جیسے بچہ اپنی ماں کی گود سے علیحدہ کیا جائے تو وہ بے قرار ہو کر روتا اور بلکتا ہے[2]۔

اس سرزمین مقدس اور دیار حبیب سے ان کی روح اور قلب کو جو تعلق اور وابستگی ہے اور اس کے چھوٹنے پر ان کے دل پر جو کچھ گذر رہی تھی اس کا کچھ اندازہ ان سطور سے ہوگا جو ان کے ایک مخلص خادم نے ان سطور کے راقم کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھی تھیں:-

> "طائف سے واپسی پر عمرہ کر کے (جعرانہ سے احرام باندھا تھا) دوسرے روز جدہ روانگی ہو گئی، حدود حرم کے ختم پر جو کنواں ہے وہاں مغرب کا وقت ہوا، نماز کے بعد سوار ہونے کے وقت حضرت پر گریہ طاری ہوا، پھر جدہ پہونچکر محمد علی خان صاحب کے مکان پر رات قیام تھا، ساری رات عجیب بے چینی میں گذری، حضرت کی خدمت میں صرف محترمی ابوالحسن صاحب اور بندہ موجود تھے اور باقی خدام و حضرات

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۳ [2] بروایت صوفی محمد اقبال ہوشیارپوری۔

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھے حضرت بار بار اٹھ کر بیٹھتے
اور ہم لوگ بھی آہٹ پا کر اٹھ جاتے اور کسی وقت سوتے بھی رہتے اور دیکھتے تھے
بندہ کو ۲۲ سال سے کئی دفعہ کافی کافی عرصہ کے لئے حضرت کی خدمت میں رہنا ہوا،
سفر حضر، عزیزوں و بزرگوں کی اموات، رمضان المبارک کی راتیں، حج کا سفر،
سفر تبلیغ وغیرہ مختلف اوقات و حالات میں حاضری نصیب ہوئی مگر ایسی حالت
پہلے کبھی نہ دیکھی تھی کبھی کھڑکی سے منہ نکال کر گاڑی میں راستوں کو دیکھ رہے ہیں اور
فرما رہے ہیں ابوالحسن آج اور عرب کی زمین دیکھ لے کل کو جانا ہی ہے، دوسرے
روز ہوائی اڈہ پر انتظار میں ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا موسم حج اور اپنے ساتھ
پاکستان جانے والوں کا کثیر مجمع، اور جدہ میں رخصت کرنے والوں کے ہجوم کی
وجہ سے کافی وقت بیٹھا ہوا، بندہ نے حضرت کو روتے ہوئے پہلے بھی بہت کثرت
سے دیکھا ہے، اکثر اوقات تو ایسا کہ اجنبی کو تو ظاہر نہ ہوتا تھا لیکن غور کرنے سے
معلوم ہوتا تھا کہ حضرت رو رہے ہیں، اور بعض وقت دیکھنے والوں کو محسوس ہو جاتا تھا کہ
نماز، تلاوت وغیرہ میں حضرت رو رہے ہیں لیکن آنسوؤں کی کثرت کا دستور نہ تھا
اور یہ قانون تھا کہ ایسی حالت میں جب کوئی ملنے والا آ گیا، یا کوئی دوسرا موضوع
سامنے آیا جس میں کسی سے ہنسی مذاق اور خندہ پیشانی کی ضرورت ہوتی، یا کسی کو
ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہوتی، تو ظاہری طور پر حضرت کی وہ حالت فوراً
ختم ہو جاتی، اور آنے والے کو کچھ محسوس نہ ہوتا، وقت کے حق کے مطابق حالت
ہو جاتی۔

اس رخصتی والے دن کی حالت بالکل نرالی تھی حضرت تشریف فرما تھے،

اور گرد کافی مجمع تھا لیکن حضرت ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسا کہ بالکل اکیلے ہوں،
کوئی بات کلام توجہ نہ تھی بے تحاشہ رو رہے تھے آنسو آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے
تھے اکثر تاثر بہ ہو رہا تھا چہرہ مبارک سرخ اور آنکھوں کے پانی سے ایسا دھل رہا
تھا جیسا کہ کوئی نل کے نیچے بیٹھا ہو بس آواز نہیں تھی حضرت ہاتھ ڈھیلے کئے
بیٹھے تھے لوگ چپ چاپ مصافحہ کرتے جاتے تھے ایک وحشت سی تھی اسی حالت
میں رخصتی ہوئی چونکہ اس قسم کی حالت بہت کم دیکھنے کی عادت تھی اس لئے
اگر خود نہ دیکھا ہوتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا بیان کرنا لغو سمجھتا اور اب بیان کرنا
ناکافی سمجھ رہا ہوں۔[1]

اسی محبت اور اخلاص نے ان کے درس، ان کی تصنیفات اور ان کے ساتھ بیعت
وارادت کے تعلق میں وہ تاثیر اور کیفیت پیدا کر دی تھی جو اہل عشق کے ساتھ مخصوص ہے۔
ان کمالات کے ساتھ جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا تھا، اور اس محبوبیت
واختصاص کے باوجود جو ان کو اکابر و شیوخ کے حلقہ میں ہمیشہ سے حاصل رہا تھا وہ
اپنے کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور دعاء نبوی "اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی أعین
الناس کبیرا" کا ان کی زندگی میں کس قدر ظہور رہا تھا، اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل
اقتباسات سے ہوگا، جو ان گرامی ناموں سے ماخوذ ہیں جو اس عاجز کے نام حجاز بھیجے
گئے تھے۔

"بعد سلام مسنون، دلّی بریلی والا پرچہ پہونچا، روانگی سے قبل ملاقات کرنے
کا بھی دل چاہتا ہے مگر وقت تنگ رہ گیا، یہاں تشریف لانا ایسے تنگ وقت میں

---

[1] مکتوب صوفی محمد اقبال صاحب بنام ابو الحسن علی۔

دشوار ہوگا، اور مجھے بھی مولوی یوسف صاحب آج کل میں بلا لیں گے، کیا اس وقت
جا کر فوراً وہاں جانا مشکل ہے، میں نے ان کو کل لکھا تو ہے کہ بجائے اس وقت
کے اگر اس وقت بلائیں تو زیادہ اچھا ہے، آپ نے یہ نہیں لکھا کہ دہلی سے روانگی
کس وقت ہے، یا روانگی براہ سہارنپور ہے، دہلی سے دریافت بھی کیا ہے مگر
وہاں سے جواب کا آنا بھی کارے دارد، بہرحال اگر ملاقات نہ ہو سکے تو اولاً اپنی
تمام تقصیرات اور بے عنوانیوں کی معافی چاہتا ہوں، ثانیاً ؎

جاتے ہو تو جاؤ، پر اتنا تو سن جاؤ
یاد جو آجائیں تو مرنے[1] کی دعا کرنا

بارگاہ رسالت پر پہنچ کر اگر یاد آجائے تو یہ الفاظ بھی عرض کر دینا، ایک
روسیاہ بندہ کی ... نے بھی سلام عرض کیا تھا، اگر ایک دو طواف بھی اس ناکارہ
کی طرف سے کر دیں تو آپ جیسے کریم جفاکش حضرات سے امید ہے کہ بار نہ ہوگا
یہی چیزیں اس ناکارہ اور نااہل کے لئے اعلیٰ تبرکات ہیں، کسی تبرک کے
لانے کا ہرگز ہرگز ارادہ نہ کریں، اس کا نعم البدل میں نے تعلقات کی قوت کے
زور میں خود ہی تجویز کر دیا کہ مجھے کھجور، زمزم وغیرہ تبرکات کی بہ نسبت دعا
اور طواف کی مسرت بھی زیادہ ہوگی اور احتیاج بھی زیادہ ہے۔

فقط والسلام زکریا مظاہر العلوم
۲۲ رجب ۶۶ھ

---

[1] کس پر، یہ کیا بتاؤں؟

"روضۂ اطہر پر دست بستہ صلوٰۃ و سلام،"

بعد سلام مسنون۔ گرامی نامہ مورخہ ۹؍ رمضان ۱۳؍ ماہ مبارک کو پہونچا، ہرچند کہ ماہ مبارک میں خط لکھنے کا وقت اور ارادہ سے بھی نہیں تھا لیکن آپ کے انتظار نے مجبور کیا کہ چند سطور تو لکھ ہی دوں۔

گرامی نامہ نے گرمی کے رمضان میں ایک شعلہ سا بدن میں پیدا کر دیا، اس کے سوا کیا عرض کروں "ھنیئاً لأرباب النعیم نعیمھم" آپ نے رات کی کیفیت اور مناظر تحریر فرما کر سابقہ حالات اور پرانے واقعات یاد دلا دئے، آپ نے یہ تحریر نہیں فرمایا کہ مدینہ طیبہ کا قیام کب تک ہے؟ تاکہ عید کے بعد کے عرائض کے متعلق رائے قائم کر سکوں، ماہ مبارک اب قریب الختم ہے اس میں دوسرا عریضہ بظاہر نہ جا سکے گا، اس کے بعد تقریباً ایک عشرہ مسلسل مختلف اسفار دہلی لاہور وغیرہ میں صرف ہوگا۔ روضۂ اطہر پر دست بستہ صلوٰۃ و سلام کی درخواست جملہ حضرات کی خدمت میں مکرر عرض ہے۔

زکریا (نظام الدین)
۲۷ رمضان ۱۳۹۳ھ

"بعد سلام مسنون۔ خیال بلکہ یقین تھا کہ دہلی میں اب کی زیارت ضرور ہوگی اور اپنی بدحالی کو پیش کر کے کچھ مانگنے کی درخواست کرونگا، اپنے دہلی کے اس سفر میں اہم مقصد آپ کی زیارت ہی تھی، مگر نظام سفر ایسا گڑبڑ ہوا کہ مجھے خود ہی مولانا مولوی محمد منظور صاحب نعمانی کی معرفت یہ کہلانا پڑا کہ آپ سیدھے ہی تشریف لے جائیں، اگرچہ معلوم ہے کہ نہ ملنے کا قلق ضرور رہا اور رہے گا، اب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے ذریعہ اپنی بدحالی کو پیش کروں،

آپ خود ہی اندازہ کرلیں گے کہ اس سے زیادہ محروم القسمت کون ہوگا جس کو
حضرت اقدس اور آپ جیسا بہترین رفیقِ سفر ملے اور کرایہ کا اس کو اشکال
نہ ہو بظاہر کوئی مانع نہ ہو پھر بھی وہ محروم رہے تو اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ
اس کی روسیاہی اس قابل نہیں کہ اس پاک دیار میں حاضری کی تب آرزو کی جا سکے
اب آپ سے انتہائی لجاجت سے درخواست ہے کہ ملتزم پر اور مواجہہ پر
آپ اس ناپاک کے لئے جو کچھ کر سکتے ہوں کر دیجئے، اللہ جل شانہ آپ کو
جزائے خیر عطا فرمائے اور یہاں کے مسلمانوں کے لئے کیا لکھنے یہ تو آپ کا
دل مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہوگا.........

فقط والسلام
زکریا مظاہر علوم
۱۰ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ

اس تعلق باطنی کیفیت اور عشق روحانی کا کچھ اندازہ کرنے کے لئے یہاں ان کے
چند مکتوبات کا اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو انھوں نے ازراہِ شفقت و کرم راقم سطور
کو حجاز کے دوران قیام میں (۱۳۸۸ھ تا ۱۳۹۰ھ) روز بیچ کر موقع پر تحریر فرمائے ہیں:۔

"ہمارا نام لے کر آ دیکھی ایک پہنچیو قاصد
جو وہ پوچھیں تو کہہ دینا یہ پیغام زبانی ہے

بعد سلام مسنون کراچی سے دو گرامی نامے پہنچے اول مفصل دوسرا اور پھر مختصر بار بار گرامی
جواب کا وقت نہ تھا، آپ نے اس ناپاک کی بیعت و رفاقت کی آرزو لکھی مگر تمہیں الطیب اس
پاک خطہ کے قابل کہاں، دو مرتبہ حاضری ہوئی مگر ایک عاجز و مطہر آدمی کی جگہ بھی قطمیر ہو

۱؎ اصحاب کہف کے ساتھ جو کتا لگ لیا تھا اس کا نام بعض کتابوں میں قطمیر لکھا گیا ہے۔

لگ گیا، بلکہ ٹھپا لگا دیا گیا۔ اب کوئی پاک ہستی ایسا منظورِ نظر نہیں آتا جس میں ہر قسم کی غلاظت مغلوب ہو جائے۔ فیاحسرتا آپ نہ معلوم کس مغالطہ میں ہیں۔ اپنی حالت یہ ہے:۔

کان ظنی بأن الشیب یرشدنی　　إذا أتی فإذا غیّی بہ کثرا

بلکہ (اب حقیقت یہ ہے)

وکنت امرأً من جند ابلیس فارتقی　　بی الدھر حتی صار ابلیس من جندی

فلو مات قبلی کنت احسن بعدہ　　طرائق فسق لیس یحسنھا بعدی

اس تعلق اور محبت کے واسطہ سے جو آپ کو اللہ رب العزت کی ستاری کی وجہ سے اس ناپاک سے بعض مغالطہ کی وجہ سے رہا ہے، درخواست ہے کہ مبارک مہینے میں مبارک راتوں میں، مبارک جگہ میں اگر دعا سے دستگیری فرما دیں تو وہ پاک ذات، وہ مقلب القلوب، قادرِ مطلق جو خطّاب[1] کو عمر بنا دے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ ایک ناپاک کو پاک بنا دے اور بدکار کو نیکوکار بنا دے۔

چشمِ فیض سے گر ایک اشارہ ہو جائے　　لطف ہو آپ کا اور کام ہمارا ہو جائے

عمر ختم ہوتی جا رہی ہے، ظاہری طور پر وقت قریب ہی آتا جا رہا ہے اور حالت یہ ہے:۔

آئی نہیں کچھ یقین کو اور بھول چکی کچھ پڑو　　کیا دکھاؤں گی اپنے پیا کو جب جا دو لو تم

دیکھتے ہی ہو گئے سفید افسوس بیتا گیا اجل　　نفس سدا ہی نہیں ہر جگہ کہتا ہوں منجھی

---

[1] شاید یہ حضرت عمرؓ کا جاہلیت میں نام یا عرف تھا۔

اپنی حالت کو کہاں تک روؤں اور اس منافقانہ تحریر سے آپ کے مبارک اوقات کو کہاں تک ضائع کروں یہ سطریں اس امید پر لکھی ہیں کہ آپ کے دل پر کچھ چوٹ لگے تو آپ اس پاک دربار میں کچھ عرض کرسکیں جن کی پاک جوتیوں کے ذریعے "لو اقسم علی اللہ لابرہ" کے مصادیق ہیں بہت ادب سے صلوٰۃ و سلام کے بعد عرض کر دیں کہ اس ناپاک کا سلام اس پاک دربار کے ہرگز لائق نہیں لیکن تم رحمۃ للعالمین ہو اس ناپاک کے لئے تمہاری ذات کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

نہ آخر رحمۃ للعالمینی　　ز محروماں چرا فارغ نشینی

یہ بھی عرض کر دیں کہ کچھ عرض کرنے کا منہ نہیں اس لئے کیا عرض کروں۔

فقط والسلام۔ زکریا۔ مظاہر علوم

۲۰ شعبان ۶۲ھ

ایک خصوصی درخواست آپ سے یہ بھی ہے کہ ملتزم پر ایک مرتبہ یہ بھی اس ناپاک کے لئے مانگ دیجئے۔

من نگویم کہ طاعتم بپذیر
قلم عفو بر گناہم کش

کیا بعید ہے کہ ان کی برکت سے پاک صاف لوگوں کی زبان کسی ناپاک کی معافی کا ذریعہ بن جائے اس میں کوئی تصنع نہیں کہ اپنی ساری گندگی کے باوجود جس چیز پر بڑا فخر اور اس کی بڑی ناز ہے وہ صرف یہ ہے کہ بچپن سے اس وقت تک اللہ کا بہت بڑا کرم یہ رہا کہ بہت سے آقا یا اہل اللہ کی

خصوصی شفقتیں انتہا سے زیادہ رہیں اس پر جتنا بھی ناز ہو کم ہے لیکن ساری خوشی ایک دم سنانے سے بدل جاتی ہے جب قیامت کے حکم ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ کا اعلان دل میں گذر جاتا ہے کاش آپ سب مخلصوں حسن ظن رکھنے والوں کے زور اس سال اس ناپاک کے اعمالنامۂ سیاہ کو بھی دھو ڈالیں تو آپ سب کا کس قدر احسان اس ناپاک پر ہو ورنہ جب کل کو میری ناپاک حالت آپ کے سامنے ہوگی تو آپ کو اپنے اس تعلق پر بھی افسوس ہوگا جو آپ نے اپنے اس مفصل گرامی نامہ میں تحریر فرمایا جو بمبئی سے لکھا........

فقط والسلام
زکریا مظاہر علوم
۲۶ ذیقعدہ ۹۶ھ

دینی حمیت اور مسلک صحیح کی حفاظت کا اہتمام

اللہ تعالیٰ نے کچھ تو فطری طور پر اور کچھ خاندانی اثرات سے شیخ کی طبیعت میں دین کی حمیت اور اپنے اسلاف اور علمائے حق کے (جو مجددی اور ولی اللہی سلسلہ سے منسلک و مسلسل طور پر وابستہ رہے ہیں) مسلک سے وابستگی اور اس کے بارے میں غیرت و ذکاوت حس شروع سے ودیعت فرمائی تھی، جب بھی ہندوستان میں دین کے بقا و وجود، اور مسلمانوں کی جداگانہ ملی و اسلامی شخصیت کے لئے کوئی خطرہ پیش آیا تو ان کی طبیعت بے چین اور ان کا دل دردمند ہوا اور انھوں نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے خود سعی اور اہل اثر کو متوجہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اسی طرح وہ اس مسلک توحید واتباع سنت اور رد بدعات کے شدت سے حامی وحافظ تھے جو ان کو وراثتاً وتعلیماً وتربیتاً اپنے اسلاف واساتذہ ومشائخ سے ملا تھا۔ ہندوستان کی آزادی وتقسیم ملک کے بعد کچھ سیاسی وانتظامی مصالح کی بناء پر بعض ایسے علماء کی طرف سے جو ہندوستان کے حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے ایک جگہ جمع ہونے اور اس ملک میں رہنے کے فیصلہ کو ہر مسئلہ پر مقدم رکھتے تھے مصلحتاً بعض ایسے اجتماعات کی نہ صرف اجازت دی گئی، بلکہ ان میں وہ خود شریک بھی ہوئے۔ اس سلسلہ میں بعض حضرات نے بزرگان دین کے ان عرسوں کو دوبارہ قائم کرنے کو مفید سمجھا جن میں مسلمان بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے اور ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ بند ہو گئے تھے یا پھیکے پڑ گئے تھے، شیخ کو جب اس طرح کی اطلاعات ملیں تو ان کے دل کو بڑی چوٹ لگی، اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ کی شان انقلابات زمانہ اور اپنے اعمال بد کے ثمرات، دیوبندی جماعت جو عرس کے بند کرنے کی ہمیشہ حامی رہی، اب وہ عرسوں کو فروغ دینے والے بن گئے۔ جس شخص کے بڑے نظام الدین کے عرس کے زمانہ میں بستی بھی چھوڑ دیا کرتے تھے اُن کا خلف یہ سوچتا ہے کہ اس موقع پر جایا جائے تاکہ پاکستان سے آنے والے احباب سے جن کو عرس کے عنوان سے اجازت مل جاتی ہے، ملاقات ہو جائے۔"

سنہ ۴۹ء میں ایک مرتبہ شیخ کی نظر اخبار "الجمعیۃ" کے ایک اشتہار پر پڑی جس میں "شیخ الہند جنتری" کا اعلان تھا، اخبار کے ایک شمارہ میں اس پر ایک تبصرہ کے دوران لکھا گیا کہ اس کی بڑی قدر وقیمت اس بات سے ہے کہ اس میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کی تصویر ہے اور اس سے کتاب کی ساری قیمت وصول ہو جاتی ہے، شیخ سے رہا نہیں گیا،

اور انھوں نے اس کی پروا نہیں کی کہ یہ اخبار علمائے دیوبند کا پرچہ ہے اور جمعیۃ العلماء کی قیادت ان کے محبوب ترین اور معزز ترین بزرگوں اور دوستوں کے ہاتھ میں ہے اس تبصرہ کو دیکھتے ہی ناچیز کے نام ایک مکتوب تحریر کیا جس میں فرماتے ہیں:-

"ایک ضروری امر کی طرف آپ کی اور مولانا منظور صاحب کی توجہ مبذول کراتا ہوں "شیخ احمد جنتری" کے نام سے کوئی جنتری طبع ہوئی ہے جس کو میں نے اب تک دیکھا نہیں لیکن اس کا اشتہار جمعیت کے پرچوں میں اور جمعیت نمبر میں طبع ہوا ہے اگر اب تک نہ دیکھا ہو تو جمعیت نمبر میں اس کا اشتہار ملاحظہ فرمالیں، اس کے متعلق اخبار "الجمعیۃ" ۱۹ اپریل ۵۰ء میں تبصرہ شائع ہوا ہے اس میں حضرت مدنی زاد مجدہم کی تصویر کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جنتری کی پوری قیمت صرف اس ایک تصویر سے وصول ہو جاتی ہے یہ مشائخ وعلماء کے آرگن کے لئے نہایت نامناسب ہے، یہ حضرات تصویر کشی کی تقبیح نہ کریں تو کم از کم مدح سرائی تو نہ کریں، اس کے متعلق اگر آپ حضرات کے نزدیک نامناسب نہ ہو تو "الفرقان" اور "تعمیر" دونوں میں تنقید ضروری ہے"

(۲۷ جمادی الآخرۃ ۶۹ھ)

اسی طرح ایک مرتبہ شیخ نے ایک قابل احترام دیوبندی عالم اور بزرگ کے متعلق سنا کہ وہ ۱۲ ربیع الاول کے ایک میلادی جلسہ میں شرکت فرمانے والے ہیں، شیخ نے اس پر اس ناچیز کو لکھا:-

"ابھی چند روز ہوئے اخبار میں ۱۲ ربیع الاول کے میلادی جلسے میں ..... کی شرکت کا وعدہ پڑھا، جب سے سوچ میں ہوں کہ جب ہمارے اکابر ایسے ایسے

ختم ہو گئے وہ ابھی بن گئی کہ اخبار جمعیۃ تو گویا اس کے پروپیگنڈہ کے لئے

وقف ہو گیا۔" (مکتوب ۱۸ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ)

اس جذبہ کا نتیجہ تھا کہ شیخ نے بڑے اہتمام و تاکید سے مجھے حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کے رسالہ "تقویۃ الایمان" کے (جو اس جماعت کے مسلک کا پورا ترجمان ہے اور اس میں توحید خالص کی ایسی کھلی طاقتور دعوت دی گئی ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے) عربی ترجمہ کا حکم دیا۔ ۱۳۸۲ھ کے ذی الحجہ (دسمبر ۱۹۶۲ء) میں جب راقم سطور مدینہ طیبہ میں حاضر تھا مجھ سے ارشاد ہوا کہ میں اس کتاب کو عربی میں منتقل کروں، میں نے وعدہ کر لیا، لیکن شیخ کو اطمینان نہیں ہوا، عزیزی سید محمد واضح ندوی کے ذریعہ (جو میرے رفیق سفر تھے) مجھے پیغام دیا کہ میں مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے سے پہلے اس کام کو مسجد نبوی میں شروع کر جاؤں، چنانچہ میں نے رخصت کے دن ۲۹ یا ۳۰ ذی الحجہ کو زوال سے پہلے باب جبرئیل و باب الرحمۃ کے درمیان بیٹھ کر حجاج کے ہجوم اور ذکر و تسبیح و درود کے شور کے درمیان میں نے اس کے مقدمہ کا ابتدائی حصہ لکھا اور اسی وقت واضح سلمہٗ نے اس کو شیخ کو جن کی نشست باب عمر کے قریب ہوتی تھی، جا کر سنا دیا، شیخ نے بڑی دعائیں دیں اور تحسین فرمائی، ۱۳۸۳ھ کی آخری تاریخوں میں ترجمہ مکمل ہو گیا، جا بجا ضروری و مفید حواشی لکھے تھے اور ایک مفصل مقدمہ اور ترجمۂ مصنفؒ بھی[1]، طباعت کے بعد شیخ نے اس کو بڑی تعداد میں خرید کر احباب و خدام اور اہل علم میں تقسیم کیا۔

---

[1] یہ عربی ایڈیشن جو "رسالۃ التوحید" کے نام سے ندوۃ العلماء کے پریس سے شائع ہوا دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں داخل ہے اور ضرورت ہے کہ اس رسالہ کی دوسری درسگاہوں اور مدارس عربیہ میں بھی داخل نصاب کیا جائے۔

اس دینی حمیت اور شرعی حمایت کا نتیجہ تھا کہ مدینہ طیبہ میں ایک ایسے منظر (جس میں معصوم نبوی ؐ تھا) قلم اٹھایا اور داڑھی کے وجوب پر ایک رسالہ لکھا جس کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا، اور اہل عرب میں اس کی وسیع پیمانہ پر اشاعت ہوئی جن میں اس بارے میں بڑا تساہل شروع ہو گیا تھا۔

یہی جذبہ تھا جس نے ان کو جماعت اسلامی کے فکر اور بانی جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تحریروں کے احتساب اور ان پر تنقید کرنے پر مجبور کیا، جب ان کے علم اور ذاتی تجربہ میں یہ بات آئی کہ ان کے اسلاف و مشائخ نے اپنی پیہم کوششوں سے اس بر اعظم میں خدا طلبی کا جو عام ذوق، محبت الٰہی و عشق رسول کی جو چنگاری اور اصلاح و تربیت نفس کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا، جس کا عمومی اور طاقتور ذریعہ "تصوف" تھا، نیز اپنے وعظ و تلقین عمل اور تصنیفات سے کسی ایک مسلک فقہی سے وابستگی کی ضرورت کا جو احساس پیدا کر دیا تھا، اور ہر شخص کے مجتہد بن جانے کے خطرہ کا بہت حد تک سد باب ہو گیا تھا، جس کا اس انتشار پذیر معاشرہ میں پورا امکان تھا، اور ائمہ مجتہدین کے ساتھ بالخصوص اور سلف کے ساتھ بالعموم حسن ظن، اعتماد واحترام قائم کر دیا تھا، ان تمام کوششوں پر ان تحریروں سے اثر پڑ رہا ہے، اور ذہن کی اصل بنیاد درحقیقت تعلق باللہ، عبودیت، فکر آخرت اور ایمان و احتساب پر ہے، دین کا سیاسی و تنظیمی تصور غالب آ رہا ہے، تو وہ بے چین ہو گئے، اور ان کے قلم سے اپنے ایک قدیم رفیق اور دوست کے نام وہ طویل مکتوب نکلا جو ان کی تحریری زندگی میں

۱؎ اس سے مراد مولانا [illegible] ہیں جو مدرسہ مظاہر علوم کے قدیم [illegible] اور انتظامی تھے، یہ مکتوب [illegible] میں لکھا گیا اور شیخ کے کئی مکتوب چھپنے کی بنا پر اس کی اشاعت ہوئی
([illegible])

مستقل رسالہ کی شکل میں "فتنۂ مودودیت" کے نام سے شائع ہوا، دوبارہ ان کی تجویز سے جماعت اسلامی ایک علمی تنقید[1] کے نام سے اس کی اشاعت ہوئی۔

اسی دینی حمیت کا نتیجہ تھا کہ جب مصر کے صدر اور قائد جمال عبدالناصر کے اقدامات سے اور قومیت عربیہ اور اشتراکیت کی کھلی ہوئی دعوت سے نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں دینی فکر و دعوت اور ذات نبوی اور اسلام کے پیغام سے عربوں کی وابستگی خطرہ میں پڑ گئی تھی، لیکن جمال عبدالناصر[2] کے چند جرأت مندانہ اقدامات کی بنا پر جن میں اس کو کامیابی ہوئی تھی، اور مغربی طاقتوں کو للکارنے کی وجہ سے ہندوستان میں علماء کا ایک بڑا گروہ اور بعض ایسی جماعتیں بھی (جن کی بنیاد اسلام کی حمیت و حمایت پر پڑی تھی) جمال عبدالناصر کی مدح اور تائید میں لگ گئی تھیں، اس وقت حضرت شیخ کی مجالس میں جمال عبدالناصر کے بارے میں کھلے طریقہ پر ناپسندیدگی کا اظہار اور اس کے متعلق سخت الفاظ استعمال ہوتے تھے، یہاں تک کہ رمضان مبارک کے مشغول اوقات میں اور عشاء کے بعد کی ایک بھری مجلس میں حضرت شیخ نے

(باقی صفحہ ۲۱۳ کا) اختیار فرمائی، شیخ کے قیام مدینہ کے دوران ان کے بعض عزیزوں نے مکتوب کی اہمیت و ضرورت اور وقت کا ایک اہم مسئلہ سمجھ کر ۱۳۹۶ھ میں اس کو رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا۔

[1] اسی نئے نام سے اس کا دوسرا ایڈیشن پہلی مرتبہ کراچی سے شائع ہوا۔

[2] جمال عبدالناصر کی بے تدبیری اور بلند بانگ دعووں کے نتیجہ میں مسلمانوں کو حرمت مدینہ کے بعد مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) شہر قدس، شہر الخلیل (مرقد سیدنا ابراہیم) اور پورے صوبۂ غربیہ بلکہ صحرائے سینا سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، افسوس ہے کہ وہ صورت حال ابھی تک قائم ہے اور بیروت کے تازہ واقعہ اور فلسطینیوں کی وہاں سے بے دخلی کے رسوا کن حادثہ نے زخم پر اور بھی نمک پاشی کا کام کیا ہے ؎

چوں از قومے یکے بے دانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

محمد میاں مرحوم کا ایک سخت تنقیدی مضمون جو ندوہ کے اردو رسالہ "تعمیر حیات" میں شائع ہوا تھا بلند آواز سے پڑھوایا اور حاضرین کو سنوایا جو شاید بعض حاضرین مجلس کو گراں بھی گذرا لیکن شیخ نے پروا نہیں کی۔

ذکر و روحانیت اور وقت کے مسلّم مشائخ اور اہل اللہ کی طرف توجہ دہانی

حضرت شیخ باوجود اپنے بلند روحانی مقام اور مرجع خلائق ہونے کے اپنے اہل تعلق کو اپنے وقت کے مستند و مسلّم مشائخ، بالخصوص شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کی طرف اصرار و تاکید سے متوجہ فرماتے رہتے تھے اور اس سے ان کی للّٰہیت، بے نفسی اور خلوص کا پورا اظہار ہوتا ہے، میرے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"رائے پور کے متعلق مکرر بھی اصرار سے عرض کروں گا کہ مشاغل کی مزاحمت کے باوجود کبھی کبھی گنجائش نکال لیا کریں، جیسا جاتا تو تشریف لے ہی گئے[1]، مولانا کا وجود بھی چراغ سحری ہے، مشاغل تو آدمی کے ساتھ لگے ہی رہتے ہیں، اس سے کب خلاصی ہو سکتی ہے"[2]

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"رائے پور کے جناب کے سفر کی حقیقی اہمیت بندہ کے نزدیک بہت ہے، اس کو بار بار کیا عرض کروں، بندہ تو بہت ہی ضروری خیال کرتا ہے کہ ایسے حضرات دنیا سے جائیں جب بھی موقع مل سکے چند روز کبھی کبھی کے ساتھ ضرور تشریف لائیں"[3]

اس بار بار کی تاکید کی وجہ یہ تھی کہ شیخ تمام دینی، علمی و اصلاحی کاموں اور

---

[1] حضرت مولانا محمد الیاسؒ [2] مکتوب ۱۳ جمادی الثانی [illegible]ھ [3] مکتوب ۱۰ محرم [illegible]ھ

خود دعوت و تبلیغ کے لیے اخلاص و للہیت، حیاتِ قلبی اور حرارتِ باطنی کو ضروری سمجھتے تھے، جو ان کے نزدیک بمنزلہ اسٹیم کے تھی، جس کے بغیر دین کی کوئی گاڑی چلتی نہیں، اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۲۶ ذی قعدہ ۶۲ھ) میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"انجن میں آگ کی ضرورت ہوتی ہے اور قلبی آگ انھیں دیاروں سے ملتی ہے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرا یقین ہے کہ قلبی اصلاح اشتغال کا ذکر ہے اور اسی جذبہ کے تحت ملکوں ملکوں پھرا جا رہا ہے کہ خانقاہیں دنیا سے ختم ہی ہو گئیں۔"[۱]

ان کے نزدیک کم از کم درجہ یہ تھا کہ ان حضرات اہل اللہ سے دل میں کدورت نہ رکھی جائے، یہ مضمون ان کی تحریروں میں بار بار آیا ہے، اور اس سوءِ ظن کی مضرت اور اعتراض پر بار بار نکیر فرمائی ہے، اپنے مشہور رسالہ "الاعتدال فی مراتب الرجال" میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو خاص طور سے متوجہ کرتا ہوں اور کرتا رہا ہوں کہ وہ اللہ والوں سے ذرا بھی دل میں کدورت نہ رکھیں، ورنہ مجھ سے تعلق نہ رکھیں۔"

شیخ کا یہ مشورہ صرف اپنے خوردوں اور مسترشدوں ہی کے لیے نہیں تھا، خود بھی بڑے اہتمام سے اس کے پابند تھے، اور کبھی کبھی دن اور کبھی کبھی وقت رہتے، جس زمانہ میں حضرت [illegible] بہٹ ہاؤس (سہارنپور) میں طویل قیام تھا، شیخ کا بلا تخلف روزانہ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کر فوراً بہٹ ہاؤس تشریف لے جاتے، اس اندیشہ سے کہ کچھ تاخیر ہو جاتی

---

۱ مکتوب [illegible]

شام کی چائے جو گھر پر سب کے معمولات میں شامل تھی مستقل چھوڑ دی تھی حضرت کو جب اس کا علم ہوا تو بہت بڑوں سے اس کا انتظام فرمانے کی تاکید کی لیکن شیخ نے اصرار سے منع فرمایا۔ اخیر زمانہ قیام میں رائے پور میں باوجود اس کے کہ حضرت کے حالات و کیفیات کی بناء پر یہ شیخ کے لئے مجاہدہ عظیم تھا، حضرت کا معمول تھا کہ جمعہ کی شام کو تشریف لے جاتے اور پیر کی صبح تشریف لاتے۔[1]

یہی حال حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی تشریف آوری کے موقعہ پر تھا کہ اطلاع ملنے پر رات کو ڈیڑھ بجے بھی اسٹیشن پر تشریف لے جاتے اور وہ اہتمام و احترام فرماتے جو مشائخ کے ساتھ ہوا کرتا ہے، مولانا کے قیام دیوبند کے زمانہ میں بھی وقتاً فوقتاً وہاں تشریف لے جاتے اور ملاقات کرتے۔

دینی کوششوں اور علمی کاموں کی قدر دانی و ہمت افزائی اور علمی ذوق

حضرت شیخ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی وسیع القلبی و سلیم النظری اور دین سے نسبت رکھنے والے کاموں کی قدر دانی کا ایسا جذبہ عطا فرمایا تھا کہ وہ ہر اس کام کی ہمت افزائی اور اگر ممکن ہو تو اس میں تعاون کے لئے آمادہ رہتے تھے، جس میں ان کو دین کا فائدہ نظر آتا تحریک قرآنی، تبلیغی جماعت، مرکزی مدارس بالخصوص مظاہر علوم، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء کا تو کیا ذکر ہے کہیں کوئی تحریری دینی اصلاحی و علمی کوشش ان کے علم میں آتی تو اس کی بڑی داد دیتے اور ہمت افزائی فرماتے۔

میرے سفر امریکہ کی تقریروں کا مجموعہ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں" شیخ نے

---

[1] سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری ص [illegible]

پڑھوا کر سُنا تو فوراً مجھے خط لکھا کہ :-

"آپ کی امریکہ کی تقریر بہت پسند آئی بار بار بڑے غور سے سنا مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اہل امریکہ کے ان سے متاثر ہونے کی کیا صورت ہے آپ نے عربی میں تقریر کر دی! اور شاید انہوں نے چند نسخے چھاپ دیئے میری تو رائے ہے کہ جتنی زیادہ سے زیادہ اس کی انگریزی و عربی میں طباعت کی صورت ہو سکے بہتر ہے اس کی اشاعت کی بہت زیادہ ضرورت ہے اگر آپ کے ذہن میں اس کی کوئی صورت ہو تو ضرور لکھیں میرا تو یہ خیال ہے کہ اہل خیر کو متوجہ کر کے ایک لاکھ کے قریب نسخے انگریزی، عربی، اردو کے خوب تقسیم کئے جائیں، اگر لکھنؤ میں اردو میں چھپے تو ایک ہزار میرے لیا جو قیمت ہو وہ بھیج دوں گا اور میرے ایک ہزار طباعت کے بعد حاجی یعقوب کے پاس بھیج دیں۔"[1]

حضرت شیخ کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں تربیت مدرسین کے انتظام کی ایک اطلاع ملی اس پر تحریر فرمایا :-

"تربیت مدرسین کی خبر سے بہت بڑی مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اگر یہ مبارک مجمع موجود ہو تو سلام مسنون۔"[2]

اکتوبر نومبر ۱۹۷۵ء میں جب دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام پر پچاسی سال گذر جانے کی تقریب میں ایک عالمی اجلاس ہوا جس میں عرب ملک کے فضلاء و اعیان کو

---

[1] خط پر تاریخ نہیں ہے بہرحال سفر امریکہ کے بعد کا خط ہے جو مئی ۱۹۷۷ء میں ہوا تھا اور واپسی اگست میں ہوئی، دوسرے مکتوب لیبیا ۱۴ مئی ۱۹۷۷ء کا لکھا ہوا ہے مطلوبہ نسخوں کی تعداد دو ہزار کر دی گئی۔ [2] مکتوب ۱۳ ربیع الآخر ۱۳۹۷ھ

خاص طور پر دعوت دی گئی[1]، شیخ نے نہ صرف اس کی کامیابی کے لئے دعائیں کیں، بلکہ اس کو بالکل اوڑھ لیا، جب تک وہ اجلاس کامیابی اور خیر خوبی کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا، شیخ کا پورا دل اس میں لگا رہا، ہر آنے جانے والے سے وہاں کے حالات وخیریت دریافت کرتے تھے، لوگوں نے بیان کیا کہ سونے کی حالت میں بھی شیخ کو اس کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے سنا گیا، ختم ہونے کے بعد مجھے مبارکباد کا خط لکھا، جس میں آئندہ کے لئے بھی ہدایات تھیں، بعض خدام سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ یہ اجلاس کس نے کرایا؟ میں نے کرایا!

یہی نہیں بلکہ کوئی مفید علمی کام ہوتا تو اس کی ہمت افزائی اور تائید فرماتے اور اس میں امکانی تعاون کے لئے تیار رہتے، میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب "نزہۃ الخواطر" کی سات جلدیں دائرۃ المعارف حیدر آباد نے شائع کی تھیں، آٹھویں جلد میں تاریخ وفات، تصنیفات وغیرہ کے سلسلہ میں جا بجا بیاض تھے، جو مصنف کی وفات ہو جانے کی وجہ سے باقی رہ گئے تھے، اور ان کا پُر کرنا اور کتاب کا مکمل کرنا ان کے فرض شناس اور سعادت مند اخلاف کے ذمہ تھا، لیکن یہ کام بڑا دشوار تھا، صرف ان شخصیتوں کی تعداد کئی سو تھی، جن کی وفات مصنف کے بعد ہوئی تھی، ناچیز راقم سطور نے فاضل گرامی ڈاکٹر عبدالمعید خاں ناظم دائرۃ المعارف کے اصرار سے اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور اس سلسلہ میں اہل علم سے رابطہ قائم کیا، اخبارات میں اعلان کیا، اور خطوط لکھے، لیکن بہت کم جوابات آئے، اور بہت کم لوگوں نے تعاون اور مدد کی، اس سلسلہ میں حضرت شیخ سے بھی مراسلت کی، جن کے یہاں وفیات لکھنے کا بڑا اہتمام تھا، اور خود ان کی تاریخ کبیر میں اس کا بڑا مواد تھا، میرے مؤلفہ کے

---

[1] اس کے مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "روداد چمن" از سید محمد الحسنی مرحوم، شائع کردہ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء۔

جواب میں ان کا جو مکتوب آیا اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"میرا خود دل چاہتا ہے کہ "نزہتہ" کی تکمیل میں جو بھی خدمت ہو سکتی ہے وہ موجب سعادت ہے، میں تو آپ سے درخواست کرتا کہ جن کی وفیات کی تلاش ہے ایک فہرست مجھے بھی بھیج دیں، مگر آنکھوں نے اس کے ساتھ ہی ٹانگوں نے ایسا معذور بنا دیا کہ نہ اپنے کتب خانہ کی کتابیں تلاش کی جاسکتی ہیں اور نہ کہیں جا سکتا ہوں .... نزہتہ کی طباعت کا تو بہت ہی اشتیاق ہو رہا ہے، اللہ کرے کہ میری زندگی میں طبع ہو جائے اور خدا کرے کہ کوئی سنانے والا بھی مل جائے تو ضرور سنوں گا، ارکان اربعہ[1] کو بھی ضرور دیکھیں، اللہ کرے کوئی سنانے والا مل جائے۔"[2]

ایک دوسرے مکتوب میں جو اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے اور جس میں اس کے بعض حصوں کی رسید ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

"نزہتہ الخواطر" کے سلسلہ میں جناب کی توجہ کا خصوصی شکریہ پیش کرتا ہوں، حق تعالیٰ شانہ اس کو جلد از جلد ہم لوگوں تک پہونچا دے کریں تو انھیں چیزوں کا بیمار ہوں۔"

شیخ کا مفید اصلاحی و دینی کتابوں کے ساتھ یہی معاملہ تھا کہ ساری معذوریوں کے باوجود وہ ان کے سننے کے لئے وقت نکال لیتے تھے، اس ناچیز کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] راقم سطور کی عربی کتاب "الأركان الأربعة" کا اردو ترجمہ برادرزادہ عزیز مولوی محمد الحسنی مرحوم کے قلم سے ہے۔ [2] مورخہ ۱۶ر ذی الحجہ ۸۶ھ از مبارکپور۔

جز موقوف کتاب پہنچ گئی، اور باوجود بیماری کے بہت وقت سے سنی۔[1]

اصابت رائے، دوربینی و دور اندیشی

شیخ کے حلقۂ تعارف نیز ملک و بیرون ملک سے تعلق رکھنے والے اور مدارس و معاصر مشائخ کے پورے حلقہ میں حضرت شیخ کی اصابت رائے، دوربینی و دور اندیشی مسلّم تھی، اور بڑے نازک اور اہم معاملات میں ان کی رائے کو قولِ فیصل سمجھا جاتا تھا، راقم سطور کو بھی بارہا اپنے اور دار العلوم کے اہم اور نازک معاملات میں شیخ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی اور ان کی اصابت رائے اور معاملہ فہمی کا تجربہ ہوا۔

اس اصابت رائے کا نمونہ یہ تھا کہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے انتقال پر باوجود ایک حلقہ کی خواہش و تقاضے اور جذباتی تعلق کے اپنے لختِ جگر عزیز مولوی ہارون کو اپنے والد و دادا کا جانشین بنانے کے بجائے جن سے اہل میوات کو جذباتی تعلق تھا، زمانہ کی نزاکتوں اور وقت کے فتنوں کے پیش نظر مولانا انعام الحسن صاحب کو جانشین بنایا جو مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے شروع سے شریک کار، دست راست اور مشیر و معاون تھے، اور جو بڑے فہم، تجربہ، علم و تقویٰ کی وجہ سے جماعت اور کام کی صحیح رہنمائی کر سکتے تھے، شیخ کے اس انتخاب اور فیصلہ پر ایک حلقہ نے احتجاج بھی کیا، اور بعض علماء و صلحاء نے شیخ کی اس رائے کو تبدیل کرنے کی کوشش کی، لیکن شیخ اس پر مضبوطی سے قائم رہے، اور بعد کے تجربوں نے اور دعوت کی موجودہ ترقی، مقبولیت اور عالمگیر وسعت نے ثابت کر دیا کہ یہ فیصلہ واقعتاً صحیح اور حق بجانب تھا۔

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ

اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر ان کی اصابت رائے، حقیقت رس نگاہ اور دور بینی نے جماعت کو بہت سے نازک مرحلوں پر رہنمائی کی اور اس کو فتنوں اور انتشار سے بچا لیا۔

رہا مدرسہ مظاہر العلوم کا معاملہ تو ان کی باریک بینی، حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی نے ہمیشہ مدرسہ کے ذمہ داروں اور نظماء و اہل اہتمام کی مدد کی اور اس کو بعض خطرناک آزمائشوں میں پڑنے اور خطرات و مشکلات سے بچا لیا، جو غلط و مستعجلانہ فیصلہ سے پیدا ہو سکتے تھے، اس کی تفصیل اور اس کے شواہد و واقعات "آپ بیتی" کے صفحات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اکرام ضیف

اکرام ضیف اگرچہ تمام بزرگوں اور مشائخ کا شعار رہا ہے، اور ان کے دسترخوان کی عمومیت و وسعت اپنے اپنے زمانہ میں ضرب المثل رہی ہے، خود شیخ کے دور میں بھی متعدد خانقاہوں اور دینی مرکزوں میں مہمانوں کا جم غفیر رہتا تھا، لیکن شیخ نے حدیث مشہور "من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ"[1] پر جس اہتمام و تندہی اور سرگرمی سے عمل کیا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، انھوں نے میزبانی و مہمانداری کو دین کا ایک اہم شعبہ اور اخلاق و نفسیات کا ایک فن بنا دیا۔

حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن فرمایا کہ دو چیزیں بڑی عبادت تھیں، ایک نکاح، ایک کھانا، تو اب دونوں میں سے

---

[1] صحیح بخاری، ترجمہ: تم میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

دین و شریعت کے احکام اور ایمان و احتساب کی روح نکل گئی، کھانے کی یہ اہمیت و عظمت اور اس کا عمل و عبادت ہونے کا تصور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے یہاں دیکھا میں ایک دن دوپہر کے کھانے میں شریک تھا، ایک صاحب آئے ہوئے تھے جن سے ان کے سلسلہ و مشائخ کے تعلقات تھے، انھوں نے کھانے میں کسی مقدمہ یا عدالتی قصہ کا ذکر چھیڑا، فرمایا، ابھی کھانا کھائیے پھر سنیں گے۔[1]

شیخ کے یہاں مہمانوں کی کثرت، کھانوں کے تنوع و افراط ہی پر اکتفا نہیں تھا، بلکہ انھوں نے اکرام ضیف کا ایک تقاضہ یہ بھی سمجھا تھا کہ عزیز مہمانوں کے مرغوبات کا بھی علم ہو اور ان کے مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے، بیسیوں عزیز و محترم مہمانوں کو اس کا تجربہ ہوا ہوگا، راقم اپنا تجربہ لکھتا ہے کہ جب سے شیخ کے یہاں میری آمد و رفت شروع ہوئی، اور شیخ کو ان چیزوں کا علم ہوا جو مجھے مرغوب ہیں، اور میں بالعموم اپنے مستقر پر ان کا عادی تھا، ان کا میری آمد سے پہلے اہتمام شروع ہو جاتا تھا، ممکن نہ تھا کہ دسترخوان ان سے خالی ہو، اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ایک مرتبہ میں نے غلطی سے یہ لکھ دیا کہ میرا آج کل مرض نقرس کی وجہ سے گوشت سے پرہیز ہے، شیخ نے یہ خط پڑھ کر بالو بابا صاحب سے جن کا نظام الدین میں ہوٹل ہے اور وہ اتفاق سے آئے ہوئے تھے، دریافت کیا کہ ترکاری سے کتنے کھانے تیار ہو سکتے ہیں؟ انھوں نے دو چار بتائے، شیخ کو اس پر اطمینان نہیں ہوا، گھر کی بچیوں سے دریافت کیا، انھوں نے آٹھ دس بتا دیے، شیخ بہت خوش ہوئے اور سب کو تیار کرنے کا حکم دیا، اس سے بڑھ کر یہ کہ گوشت سے (جس کے بغیر وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے) جب تک میرا قیام رہا دست کش رہے اور سبزی پر اکتفا کرتے رہے

---

[1] صحبتے با اہل دل (مجموعہ ملفوظات حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی) آٹھویں مجلس ۲۳ جنوری ۱۹۶۲ء

یہ تو خدام کے ساتھ تعلق کی ایک شان تھی مشائخ اور بزرگوں کے ساتھ جو اہتمام ہوتا ہوگا
اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مہمانوں کی تعداد کبھی سیکڑوں تک اور رمضان میں ہزاروں تک پہونچ جاتی لیکن اس سے کوئی بدنظمی، اضطراب و انتشار پیدا نہ ہوتا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مولانا نصیر الدین صاحب کی شکل میں ایک مخلص معاون عطا فرما دیا تھا، جو ان سب کے کھانے کا انتظام کرتا، کھانا مدرسہ کے باورچی خانہ سے پک کر آتا اور مخصوص مہمانوں کے لئے کچھ کھانا گھر سے بھی پک کر آتا، شیخ دسترخوان کی پوری نگرانی فرماتے، مہمانوں کو علی حسب مراتب انزلوا الناس منازلهم پر عمل کرتے ہوئے ترتیب سے بٹھاتے، ان کے مرغوبات کو ان کے سامنے رکھتے، اگرچہ دسترخوان پر اول سے آخر تک بیٹھے رہتے، ایک جماعت (جس کو شیخ کی اصطلاح میں جزء بھی کہا جاتا تھا) فارغ ہوتی، دوسری جماعت آتی، شیخ اپنی پوری دلچسپی و مستعدی کا اظہار فرماتے، لیکن غور سے دیکھنے والے تاڑ لیتے کہ شیخ نے بہت کم تناول فرمایا ہے۔

اس دسترخوان کے آداب میں یہ بھی تھا کہ جس کے سامنے جو چیز رکھی جائے یا جس کو چائے کی پیالی پیش کی جائے وہ دوسرے کی طرف نہ بڑھائے، اس لئے کہ اس سے بعض اوقات انتظام کرنے والوں کو غلط فہمی ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص فارغ ہوگیا، حالانکہ اس نے دوسرے کی تواضع کر دی اور خود کچھ نہیں لیا، اس موقع پر حضرت شیخ فرماتے کہ یہاں کا انتظام یہاں والوں کے ہاتھوں میں ہے، آپ کو اگر انتظام کرنا ہے تو اپنے گھر جا کر کیجئے گا، تجربہ سے اس میں بڑی مصلحت معلوم ہوئی، بعض وقت حضرت شیخ کی اس روک ٹوک سے بعض نازک مزاج والوں کو گرانی بھی ہوتی لیکن شیخ مصالح عامہ میں اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔

مدارس دینیہ سے گہرا تعلق

شیخ کی ساری تعلیم و تربیت، ذہنی و اخلاقی نشو و نما اور اکتساب علم و کمال سب (ایک عربی دینی) مدرسے کے اندر یا مدرسہ کے ماحول یا مدرسہ سے تعلق رکھنے والوں اور اس کو اپنے قلب و جگر اور اہل و عیال سے زیادہ عزیز رکھنے والوں کے آغوش میں ہوا تھا، پھر انھوں نے ایک مثالی مدرسہ (مظاہر العلوم) کا وہ زریں دور دیکھا تھا جب منتظمین و اساتذۂ مدرسہ اخلاص و للہیت ایثار و قربانی اور زہد و ورع کا پیکر اور طلبہ طلب صادق، انقطاع و یکسوئی اور طلب علم میں انہماک کا نمونہ تھا اور اپنے اساتذہ سے محبت و عقیدت اور اطاعت و انقیاد کا نمونہ ہوتے تھے، اس لئے مدرسہ ان کی فکر و توجہ کا مرکز، ان کے تخیلات و توقعات کا مسکن اور ان کی روح کا نشیمن بن گیا تھا، اور وہ اس کو علوم دینیہ کے بقا، مسلمانوں کی صحیح دینی رہنمائی، ان کو فساد عقیدہ اور فساد عمل سے بچانے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے، حقیقت میں انھوں نے "آپ بیتی" کا سلسلہ مدارس کے اسی دور کی یاد تازہ کرنے اور انھیں خصائص کو دوبارہ پیدا کرنے کے خیال سے مرتب فرمایا، اور یہی مضمون ہے، جو اس کے زیادہ تر صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اسی لئے ان کو تمام مدارس دینیہ سے جو صحیح مسلک پر قائم تھے بہت گہرا قلبی تعلق تھا، وہ ان میں کسی انتشار و اختلاف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور شاید کبائر کے بعد جس چیز سے شیخ کو سب سے زیادہ نفرت تھی، اور اس پر غصہ آتا تھا وہ کسی عربی مدرسہ میں طلبہ کی اسٹرائک تھی۔[1]

[1] شیخ کا اس پر مستقل رسالہ "رسالہ اسٹرائک" ہے۔

لیکن بمصداق ایک عربی شعر کے ؎

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ

تجری الریاح بما لا تشتہی السفن

زمانہ کے فساد اور ماحول کی انتشار انگیزی کا اثر ان قدیم مدارس پر بھی پڑا اور وہاں بھی احتجاجوں اور اسٹرائکوں کا دور شروع ہو گیا۔ سنہ ۱۳۸۸ھ (سنہ ۱۹۶۹ء) میں دار العلوم دیوبند میں اسٹرائک ہوئی۔ اور جو صرف تک انتشار و ہنگامہ برپا رہا، شیخ نے ان حالات سے متأثر ہو کر مجلس شوریٰ سے استعفاء دے دیا، اور آخر تک اس پر قائم رہے لیکن افسوس ہے کہ سنہ ۹۸ھ میں خود مظاہر العلوم میں اسٹرائک ہوئی، شیخ کے دل پر اس سے بڑی چوٹ لگی، وہ اس موقعہ پر اکثر یہ شعر پڑھتے اور دوستوں اور عزیزوں کو خطوط میں لکھتے ؎

وہ محرومِ تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے

کہ جو منزل بمنزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

مدرسہ مظاہر العلوم ہی میں نہیں شیخ کو اسٹرائک سے خواہ وہ کسی دینی مدرسہ میں ہو سخت کراہیت و نفرت تھی، اور وہ ان طلبہ کو جو اسٹرائک میں قائدانہ حصہ لیں کسی رعایت حسن ظن و اعتماد، اور کسی دینی اعزاز کا اہل نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ بسا اوقات ایسا ہوا کہ جب دار العلوم، ندوۃ العلماء میں اسٹرائک کی ان کو خبر ملی تو ان کو اس سے بھی صدمہ پہنچا، اور وہ کبھی ان طلبہ سے منشرح نہیں ہوئے جن کے متعلق ان کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ انھوں نے اس اسٹرائک میں حصہ لیا تھا۔

مسلسلات کے موقعہ پر بھی بعض وقت گھنٹہ لگا دیا گیا یا اعلان کیا گیا کہ جو کوئی

کسی مدرسہ میں اسٹرائک میں حصہ لیا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، اجازت دینے میں بھی ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا گیا کہ جس نے کبھی اسٹرائک میں تھوڑا بہت حصہ لیا ہے اس کو ہرگز یہ شرف نہ عطا کیا جائے بلکہ ان کو اپنے حلقۂ ارادت میں بھی لینے سے ـــ انکار تھا ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں ایسے سورماؤں سے بیعت کا تعلق بالکل نہیں رکھنا چاہتا۔[1]

افسوس ہے کہ حضرت شیخ کے دل پر زندگی کے آخری دور میں دارالعلوم دیوبند کے اختلاف و انتشار کا داغ لگا، پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے کہ حجاز کے قیام میں بھی آپ کو اس مسئلہ سے کتنا تعلق خاطر تھا، اپنے ایک مکتوب میں جو اس قضیہ کے اپنے آخری حدود سے پہلے کا لکھا ہوا ہے تحریر فرماتے ہیں:-

"دیوبند و سہارنپور کا ہر وقت فکر ہے کہ میرے بڑوں کے دو باغ ہیں کہ صلاح و فلاح سے اگا رہنے لگا تھا اور ہم ناخلفوں نے اس کو کس طرح برباد کرنا شروع کر دیا، خیال [illegible] بڑوں کی نصیحت تھی کہ جب تک اخلاص رہے گا یہ پھلے گا اور پھولے گا، اور جب اخلاص نہیں رہے گا برباد ہو جائے گا، اس کا منظر اب سامنے آ رہا ہے۔"[2]

اس کے بعد ۲۲ رمضان ۹۷ھ کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ سے ملنے کو اور دیوبند کے متعلق گفتگو کو بہت ہی جی چاہ رہا ہے، جب ادھر سے کوئی آتا ہے تو بغیر پوچھے مجھ سے نہیں رہا جاتا اور سن کر طبیعت مکدر ہوتی ہے کاش یہ حضرات حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ وغیرہ کی سوانح عمریاں ہی دیکھ لیتے تو اچھا تھا، میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہ لوگ

---

[1] زمانۂ اسٹرائک صـ [2] مکتوب مورخہ ۱۰ رمضان ۹۷ھ

ان حضرات کی سوانح کے علاوہ کچھ اور نہ پڑھ سکیں۔"

حجاز کے آخری قیام میں ہندوستان سے کوئی آتا یا کوئی ایسا آدمی جس کا ان مدارس سے کچھ بھی رابطہ تھا ملتا تو سب سے پہلے دیوبند ہی کے متعلق سوال ہوتا۔ افسوس ہے کہ حضرت شیخ کی زندگی میں یہ معاملہ پورے طور پر پردۂ خفا ہوا ورنہ ان کو بڑی مسرت ہوتی، امید ہے کہ ان کی دعائیں، اور ان کا سوزِ دل رنگ لائے گا، اور ان کو اس دنیا میں نہیں تو اس عالم میں دارالعلوم کے اپنے بانیوں کے مقاصد، اور اپنے مخلص کارکنوں کے عزائم اور خواہشات کے مطابق دین کی خدمت اور علومِ شریعت کی اشاعت کا کام پورے انہماک، یکسوئی، اور تعاون کے ساتھ انجام دینے کی خبر سے مسرت ہوگی۔

اپنے اساتذہ و مشائخ کے ساتھ وفا شعاری اور خدام و احباب کے ساتھ محبت و شکر گذاری کا تعلق

حضرت شیخ کے حالات و کمالات میں ایک نمایاں وصف اپنے سلسلے کے شیوخ اور مربیوں و محسنوں کے ساتھ وفا شعاری، ان کی علمی یادگاروں کی حفاظت بلکہ زیادہ سے زیادہ اشاعت علمی دنیا میں ان کے تعارف اور ان کے علمی و دینی فیوض کے دائرہ کو وسیع کرنے کا وہ بے پایاں جذبہ تھا جس کی نظیر اس زمانہ میں ملنی مشکل ہے وہ ان کے ایک ایک حرف کو آنکھوں سے لگاتے اور دنیا میں دور دور پہونچانے کے لئے ساعی رہتے تھے۔

اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے حضرت گنگوہیؒ کی بخاری کی تقریرات کو جن کو حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے قلم بند کیا تھا "لامع الدراری" کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا، اس پر خود اپنے حواشی کا اضافہ کیا اور ایک نہایت وقیع مقدمہ لکھا اور جو ایک عربی کا

اس کے تعارف کی غرض سے اس ناچیز سے بھی کتاب کا عربی میں تعارف اور مقدمہ لکھوایا۔

اسی طرح حضرت گنگوہی کی ترمذی پر تقریرات و تحقیقات کو جو "لامع الدراری" کی طرح مولانا محمد یحییٰ صاحب کی قلم بند کی ہوئی تھی "الکوکب الدری علی جامع الترمذی" کے نام سے طبع اور شائع کروایا، اس پر بھی مقدمہ لکھنے کا مجھے امر ہوا۔

جہاں تک حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب "بذل المجہود" کا تعلق ہے، اس کی طباعت و اشاعت کا تو حضرت شیخ پر ایسا غلبہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طباعت کی تکمیل کے بغیر ان کو چین ہی نہ آئے گا، جو لوگ اس کام میں ذرا بھی معاون و شریک رہتے ان کو حضرت شیخ کی خاص دعائیں اور خوشنودی و التفات حاصل ہوتا، یہ سب اپنے اسلاف و اساتذہ و مشائخ کے وفادارانہ و عاشقانہ تعلق کا کرشمہ تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خود شیخ کی مقبولیت و ترقی میں بھی اس کو خاص دخل تھا۔

اپنے بزرگوں کے ان آثارِ علمیہ کی حفاظت و اشاعت کے علاوہ ان کے حالات و سوانح کی تدوین اور اشاعت کی طرف بھی پوری توجہ اور اس سے پوری دلچسپی اور وابستگی تھی، اس سلسلہ میں عزیز سعید مولوی محمد ثانی مظاہری ندوی کو حکم ہوا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی سوانح نئے طرزِ تصنیف اور نئے مواد کے ساتھ مرتب کریں، اللہ نے عزیز موصوف کو اس کی توفیق دی، انھوں نے "حیاتِ خلیل" کے نام سے ۱۳۹۶ھ (۱۹۷۶ء) میں اس کی تکمیل کی، مؤلف موصوف اس کو جستہ جستہ حضرت شیخ کی خدمت میں بھیجتے رہے، حضرت شیخ ان کے نام تحریر فرماتے ہیں:-

"بعد سلام مسنون تمہاری تالیف "حیاتِ خلیل" کا مسودہ مدینہ پاک میں پہونچکر موجبِ مسرت ہوا تھا، میں اس کو سن سن کر وہاں سے تری واپسی کرتا رہا، اللہ تعالیٰ

تمہاری اس محنت کو قبول فرما کر دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے، بشاء اخضر

تم نے بڑی محنت و کاوش سے حالات تحقیق کے بعد جمع کیے ہیں[1]۔

حضرت شیخ ہی کے ایماء پر عزیزی سید عبید اللہ حسنی (ابن محمد الحسنی مرحوم) نے عربی میں اس کی تلخیص اور تعریب کی اور شوال ۱۴۰۹ھ میں بیروت سے عربی رسالہ بھی شائع ہوا۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ کی سوانح حیات کی ترتیب میں بھی حضرت شیخ کا ایماء و مشورہ اور رہنمائی اول سے آخر تک شامل رہی، اور اس میں بھی اسی وفا شعاری کا جذبہ کام کر رہا تھا جو ان کے خمیر و ضمیر میں ودیعت تھا، پھر حضرت شیخ کے حکم و ایماء ہی پر عزیزی محمد ثانی سلمہ نے مولانا محمد یوسف صاحب کی ضخیم یادگار سوانح، پھر ان کے جواں سال و جواں مرگ فرزند مولوی محمد ہارون کی مختصر سوانح تصنیف کی، اور حضرت شیخ کی خاص دعائیں اور خوشنودی کا پروانہ حاصل کیا۔

یہ بات حضرت اپنے مربی و محسنوں کے ساتھ مخصوص نہ تھی، جو شخص بھی شیخ کے کسی کام میں ذرا بھی اعانت کر دیتا، اس سے شیخ کو کچھ بھی سہولت حاصل ہوتی تو اس کے ساتھ تشکر و امتنان کا ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ خود شرمندہ ہوتا، ۱۳۹۳ھ کے سفر حجاز میں خدام کے لئے ویزہ ملنے میں راقم سطور نے اپنے تعلقات کی بنا پر کچھ خدمت کی سعادت حاصل کی تھی، اور ان خدام کی وجہ سے حضرت شیخ کو قدرتاً سہولت و راحت حاصل ہوئی تھی، اس پر حضرت شیخ نے اس ناچیز کے نام حجاز سے جو خط لکھا، اس کو پڑھ کر اب بھی راقم پانی پانی ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں:۔

---

[1] مکتوب بنام مؤلف مورخہ رجب ۱۳۹۳ھ از سہارنپور (حیات خلیل) [illegible]

"اس میں ضرور برکت ہے اور ضرور انتفاع کہ اس مرتبہ حاضری کے بعد سے
کثرت سے صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ رفع مراتب و درجات عالیہ
کے لئے بہت ہی اہتمام سے اور بہت ہی کثرت سے دعائیں کرتا رہا۔ لکھتے ہوئے
تو شرم آتی ہے لیکن اس مرتبہ کی حاضری کا سہرا حضرت جناب کے سر ہے اس لئے
اگر اس حاضری میں اعمال حسنہ بھی کئے گئے ہوں تو ان شاء اللہ اس کے ثواب میں
آپ کی شرکت یقینی ہے۔ اس احسان کے بدلہ میں دعائیں ہی کر سکتا تھا، وہ
میں نے بحمد اللہ کیں۔ تحدیث نعمت کی بنا پر آپ کی خدمت میں عرض بھی کر دیا۔"[1]

یہی حال کم و بیش سب کے ساتھ تھا، جہاں تک دعاؤں کا تعلق ہے ایک مرتبہ فرمایا کہ
اس مرتبہ جب حاضر ہوا کر حرم شریف میں بچپن کے پرانے پرانے لوگ یاد آئے کاندھلہ کا ایک فقیر
مانگنے آتا تھا (یا یہ فرمایا کہ ایک شخص راستہ میں بیٹھا رہتا تھا) وہ بھی یاد آگیا تو میں نے
اس کے لئے بھی دعا کی۔ شیخ کی انہیں شفقتوں اور نوازشوں کو دیکھ کر اس پرانے جملے کی
تصدیق ہوتی تھی۔ "ہم القوم لا یشقی بہم جلیسہم" (یہ وہ حضرات ہیں جن کے
پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔)

شفقت و تعلق

شیخ کی طبیعت میں (جو صحیح النسبت مشائخ اور نائبین رسولؐ کی سنت کے
مطابق) اہل تعلق کے ساتھ ایسی شفقت و محبت و دلجوئی تھی جو بعض اوقات
ماں کی شفقت کی یاد تازہ کر دیتی تھی اور ایک نکتہ شناس نوجوان[2] نے چند دن شیخ کی شفقت کا

---

[1] مکتوب مورخہ رمضان ...ھ

[2] اس سے مراد صوفی عبد الرب صاحب (ابوظبی) مرحوم ہیں

تماشہ دیکھ کر، اور مزہ چکھ کر گھر جا کر ایسے ہی خط لکھا تھا جس سے اس شفقت کا اظہار ہوتا تھا، اس شفقت و تعلق کا تجربہ سینکڑوں خدام و اہل تعلق کو ہوا ہوگا" بحسب کل جلیس آنہ اکرم علیہ من صاحبہ" راقم سطور حضرت و شرمندگی کے ساتھ اپنے چند واقعات بیان کرتا ہے جن سے اس شفقت کا کچھ اندازہ ہوگا۔

جب راقم کو نزول الماء (موتیا بند) ہوا اور ایک آنکھ کے آپریشن کی ناکامی کی وجہ سے ضعف بصارت کا عارضہ لاحق ہوا تو فرمایا کہ "میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم خواہ حجاز کا ہو خواہ یورپ و امریکہ خواہ اندرون ملک کا کوئی سفر تنہا نہ کرو گے، اپنے داعیوں کو بے تکلف لکھ دیا کرو کہ میرے ساتھ دو رفیق ضروری ہیں، اگر وہ دو کا انتظام نہ کر سکیں تو ایک کی بہرحال شرط ہے، اگر ان کو غرض ہوگی تو منظور کر لیں گے، نہیں تو شاہ بخیر با سلامت" خبردار اس میں تکلف نہ ہو" ایک مرتبہ راقم نے حیدرآباد کا تنہا ہوائی سفر کیا، وہاں ایک جلسہ میں سیرت پر تقریر کرنی تھی، اور صرف دو دن ٹھہرنا تھا، ساتھیوں نے دہلی کے ہوائی اڈہ پہونچا دیا، حیدرآباد کے دوستوں نے وہاں اتار لیا، پھر سوار کرا دیا، شیخ نے اس پر مجھ سے جواب طلب کیا، اور فرمایا کہ میری ممانعت کے باوجود یہ سفر تنہا کیوں کیا گیا؟ بعض مرتبہ مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ ساتھ حاضری ہوئی، رات کا وقت تھا، بھائی سعدی کے مکان پر پہونچ کر مجھے حکم فرما دیا کہ آنکھ میں تکلیف رہتی ہے، اور تاکید کر دی کہ شور نہ ہو، خود بدولت عمرہ کے لئے چلے گئے، اور فرمایا کہ تم عمرہ کل دن میں کرنا، مدینہ طیبہ کے قیام کے زمانہ میں مجلس ذکر میں جب صبح کو حاضر ہوتا، تو روزانہ کا معمول تھا کہ عین ذکر کی حالت میں ایک چمچہ تلے ہوئے انڈے کا، اور ایک خمیرہ کا میرے منہ سے لگا دیا جاتا، اسی زمانہ میں اگر میرا ریاض کا کوئی سفر پیش آتا، تو خدام کو ارشاد ہوتا کہ جتنے دن علی میاں کا

رہا کرتا رہتا ہوا اتنے دن کی خوراک ساتھ کر دو، عرصہ گذر جانے کے بعد جب مکہ معظمہ
مدینہ طیبہ حاضری ہوتی تو حضرت کو اپنا یہ معمول یاد رہتا، اور خمیرہ کے متعلق ہدایت ہوتی
مدینہ طیبہ کے قیام میں اگر میرے پاس رابطہ یا جامعہ کی موٹر نہ ہوتی تو شیخ کو برابر فکر رہتا
کہ میں پانچوں وقت نمازوں کے بعد اپنی قیام گاہ پر کیسے جاتا ہوں، پھر جب حضرت کو
اطلاع ملتی کہ اس کا انتظام ہو گیا ہے، جب اطمینان ہوتا، میری دوسری آنکھ کے
آپریشن کی حضرت کو مجھ سے زیادہ فکر معلوم ہوتی تھی، اور حضرت ہی کے حکم پر امریکہ میں
آپریشن کرانے کا فیصلہ کیا، پھر جب میرے بیٹے نے ٹیلکس کے ذریعہ نیویارک سے اطلاع دی کہ
یکم جولائی ۸۰ء کو فلاڈلفیا (امریکہ) میں آپریشن ہونے والا ہے تو حضرت نے[1] اسی وقت
حاضر الوقت خدام کو حرم شریف روانہ کر دیا کہ دعا کا اہتمام کریں، اور خود بھی دعا کی
طرف متوجہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے آپریشن کامیاب کر دیا، اس طرح کے واقعات
خدام کو بکثرت پیش آئے ہوں گے، میں نے اپنے چند واقعات لکھے ہیں کہ ان سے
اس شفقت بے پایاں کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

انقطاع و تبتّل اور یکسوئی کا فطری رجحان اور جذبہ

یوں تو حضرت شیخ نے جیسا کہ صفحات بالا سے معلوم ہوا ہوگا، ساری عمر تدریس
واشاعت، مجلسوں اور واردین صادرین کے ہجوم میں گذاری، اور آخر میں جنوبی افریقہ
اور انگلستان کے ایسے سفر کئے، جن میں لوگوں نے پروانہ وار ہجوم کیا، اور مور و ملخ کی طرح
امنڈ آئے، اور حضرت شیخ نے اپنی قوت عزیمت، عالی ہمتی، اور جفاکشی سے نہ صرف

---

[1] یہ حجاز کے وقت کی بات تھی، وقت کے فرق کی وجہ سے وہ وقت امریکہ میں صبح کا تھا اور اسی وقت آپریشن ہونے والا تھا۔

اس کو تنہا، بلکہ سرگرمی کے ساتھ افادہ و ارشاد میں مصروف رہے اور ان لوگوں کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کو ہجوم سے وحشت اور جمعیت سے عدم مناسبت ہے۔

لیکن اولاً تو فطری طور پر، ثانیاً اس تربیت کے اثر سے جس میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کی احتیاطوں کو خاص دخل ہے شروع ہی سے شیخ کی طبیعت میں یکسوئی و گوشہ گیری مرغوب اور پسند تھی اور یہ ان کے اندر کا تقاضا تھا، پھر طریق ولایت سے مناسبت نے اس میں اور شدت و قوت پیدا کر دی، یہاں پر ان کے بعض مکاتیب اور کتابوں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے اس فطری جذبہ کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

"مجھے مجمع سے وحشت ہے کسی مجمع میں بیٹھ جانا میرے لئے انتہائی مجاہدہ ہے حتی کہ اپنے کمرہ میں اگر تنہا ہوں، اور کمرہ کی زنجیر کھلی ہوئی ہو تو اس کی بہ نسبت مجھے اس میں زیادہ لطف اور سکون ہوتا ہے کہ اندر کی زنجیر لگی ہو .... جلسہ جلوس کی خصوصیت نہیں ہے مجھے تقریبات میں بھی شرکت سے وحشت ہوتی ہے۔

قفس وا ہم و لیس را او حیت از نہ چہ کار پرسی
کہ پیش از بال و پر پرواشتند از آشیاں ما را[1]

"اپنی جوانی کا زمانہ بہت یاد آتا ہے جب میں تھا اور میرا کمرہ، کہ کوئی آدم نہ آدم زاد، اب اپنی معذوریوں نے دوسروں کا تو مجھے خود محتاج بنا دیا کہ زنجیر کسی کی مدد کے بغیر لگا دینا کرنا بھی مشکل ہے اور اس پر ہر وقت کا ہجوم وحشت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

باغ میں لگتا نہیں جنگل میں گھبراتا ہے دل
کس جگہ لے جاکے بٹھیں ایسے دیوانہ کو ہم

---

[1] الاعتدال ص ۲۲

پر کبھی عمل نہ ہو سکا۔[1]

"اب تو بہت دن سے بیعت کو دل بھی نہیں چاہتا، اللہ کا شکر ہے سلسلہ کے بقا کے لئے بہت سے احباب ہیں جو ہر طرح سے اہل ہیں بیعت کئے ہوئے ہیں،

اب تو بسا اوقات یہ شعر بھی زبان پر آجاتا ہے ؎

یک چند تو عاشقی بنمودی تو ز سبب کار

دیوانہ باش تا سلسلہ بند تو شوند

سلسلہ باقی رہنے کے لئے تو اسباب پیدا ہو چکے ہیں اب تو میرے لئے کوئی گوشۂ عافیت ہی تجویز فرمائیے۔"[2]

شعری و ادبی ذوق

حضرت شیخ کے متعلق (جنھوں نے ایک خالص تقویٰ و دینی علمی و دینی ماحول میں پرورش پائی تھی، اور جن کا شعار درس و تدریس حدیث کا شغل تھا) مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے۔ ان کا شعری و ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور نفیس تھا، اور ان کو غالباً سیکڑوں عربی، فارسی، اردو کے اشعار یاد تھے، اور وہ اپنے خطوط، رسائل و تصنیفات میں ان کا نہایت برمحل استعمال فرماتے تھے۔ خود بیان فرمایا کہ "ایک مرتبہ (آغاز جوانی میں) ایک دوسرے قصبہ میں شب کو جانا ہوا جہاں کچھ بے تکلف دوست جمع تھے، وہاں عشاء کے بعد بیت بازی شروع ہوئی (جو اس زمانہ کے مہذب و زندہ دل نوجوانوں اور قصبات کے شرفاء کا محبوب مشغلہ تھا)

---

[1] بنام ابوالحسن علی ۱۰ رجب ۸۸ھ [2] ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء بنام ابوالحسن علی۔

اس میں ایسا انہماک ہوا کہ کچھ پتہ نہ چلا کہ رات کتنی گئی، اچانک اذان کی آواز آئی تو خیال ہوا کہ کسی نے بے وقت اذان کہہ دی، ابھی تو بیٹھے ہی تھے۔ معلوم ہوا کہ صبح صادق ہو گئی اور یہ فجر کی اذان تھی۔"

یہاں پر صرف ان خطوط سے جو مصنف کے نام لکھے گئے ہیں اور "آپ بیتی" سے اردو کے چند اشعار منتخب کر کے لکھے جاتے ہیں، جن سے شیخ کے اعلیٰ شعری و ادبی ذوق کا کچھ اندازہ ہوگا، اور معلوم ہوگا کہ شیخ کا ذہنی و عملی نشوونما اور مذاق اس ماحول سے بالکل مختلف تھا جس کے متعلق کبھی کسی دل سوختہ شاعر نے کہا تھا کہ ؎

شعر من بمدرسہ کے برد؟

ان ابیات کو حذف کر دیا گیا ہے، جو کسی تقریب سے اس کتاب میں آ گئے ہیں ؎

وہ لکھیں گے مجھے خط کا جواب اے دل کہا — یہ تو نے خواب دیکھا یا کہ مضمون خیالی ہے

پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر — چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

میں گو رہا رہین ستم ہائے روزگار — لیکن تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا

رفتہ رفتہ راہ و رسم دوستی کم ہو تو اب — ترک کرنا خط کتابت یک قلم اچھا نہیں

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے — یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

شب وصال میں خوف سحر لگی سی ہے — صبح بے درد مرا رنگ فق اڑی سی ہے

ان کے خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال — کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبار انتظار

مدت سے لگ رہی تھی لب بام تک نگہ — تھک تھک کے گر گئی نگہ انتظار آج

رہ گئی بات کٹ گئی شبِ ہجر | تم جو آ گئے تو کیا سحر نہ ہوئی

وصل کی تجویز باتوں باتوں میں تدبیریں کہیں | آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا | سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی | مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط | بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق | وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں | محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے | جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا | جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

دکانِ مے فروش پہ سالک پڑا رہا | اچھا گزر گیا رمضان بادہ خوار کا

کیا کہوں جرأت کہ کچھ بھاتا نہیں | کچھ تو بھایا ہے جو کچھ بھاتا نہیں

وہی قاتل وہی مخبر وہی ہے منصف | اقربا میرے کریں قتل کا دعویٰ کس پر

گرے میری نظروں سے خوبانِ عالم | پسند آ گئی تیری صورت کچھ ایسی

دیر و حرم میں روشنی شمعِ قمر سے ہو تو کیا | مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں

دیدِ لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور | میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشائی

تمنا درد دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی | نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

سرخ رو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد | رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی | اے ابرِ کرم بحرِ سخا کچھ تو ادھر بھی

۱؎ مندرجہ بالا اشعار ان خطوط سے اخذ کیے گئے ہیں جو مصنف سوانح راؤ ابو الحسن علی کے نام ہیں

تو وہ داتا ہے کہ دینے کے لئے — در تری رحمت کے ہیں ہر دم کھلے

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال — کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ سی ہے دل میں ہمارے لگی ہوئی

وصل ہو یا فراق ہو غالب — جاگنا ساری رات مشکل ہے[1]

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے — کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے

ہماری بھی شب کیسی شب ہے الٰہی — نہ روتے کٹے ہے نہ سوتے کٹے ہے

مت آئیو وہ وعدہ فراموش آپ بھی — جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب[2]

لہ مقتبس از "آپ بیتی" (۱-۷)　　ٹہ بار بار سنے ہوئے اشعار

بابِ دہم

تصنیفات و رسائل پر ایک تبصرہ

تصنیفی ذوق اور اہم علمی و تحقیقی تصنیفات

درس و تدریس کے انہماک، ذکر و نوافل کی یکسوئی، مہمانوں کی کثرت اور واردین و صادرین کے ہجوم کے باوجود شیخ کی طبیعت میں شروع ہی سے تصنیفی ذوق اور تحریری کام میں انہماک ودیعت تھا، اور جب پہلی دفعہ مشکوٰۃ پڑھا رہے تھے (جو شوال ۱۳۴۱ھ میں شروع ہوئی تھی) تو ۲۸ ربیع الاول کی شب میں ۱۲ بجے تحیۃ الوداع پر لکھنا شروع کیا اور ایک دن ڈیڑھ رات میں شنبہ کی صبح کو پورا کر لیا۔ خواب میں ایک اشارہ کی بنا پر ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ بروز چہارشنبہ "جزء المعوذات" کی تالیف شروع ہوئی اور ۵ رجب ۱۳۵۹ھ یوم جمعہ کو ختم ہو گئی۔[1]

واضح رہے کہ یہ رسالہ تحیۃ الوداع جو ایک دن ڈیڑھ رات میں لکھا گیا ہے، علمی، معنوی اور اپنے مواد و معلومات کے لحاظ سے "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کا مصداق ہے اور اس کے اندر اس موضوع پر اتنا محدثانہ و محققانہ مواد آ گیا ہے جس کو دیکھ کر (اگر کسی کو بتلایا نہ جائے) یہ خیال بھی نہیں گذر سکتا کہ یہ ایک دن ڈیڑھ رات میں

---

[1] آپ بیتی ص ۱۳۰-۱۳۱

پورا ہوا ہے، یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس وقت شیخ کی عمر ۲۷ سال کی تھی، اس میں جو حواشی کا
اضافہ بعد میں کیا گیا ہے، لیکن متن اسی وقت تیار ہوگیا تھا، ۱۳۸۹ھ میں جب انھوں نے
علی گڑھ میں آنکھ کا آپریشن کرایا، اور کسی نئی تصنیف کا موقع نہ رہا، تو ان کو یہ پرانی
کتاب یاد آئی اور انھوں نے اس میں کہیں کہیں رجال کی تفصیل اور قابل توضیح چیز
کی توضیح فرمائی، اور جہاں طویل عبارتوں کا حوالہ دیا گیا تھا، ان کو نقل کروادیا، جن مقامات
کے نام آئے تھے ان کی تعیین اور تشریح فرمائی، اور اس میں اپنے بعض خورد سال
نیازمندوں سے بھی مدد لینے میں تأمل نہیں کیا، جو اہل علم اور تحقیق کا شیوہ ہے،
اس موقع پر حجرات نبوی کی بحث، ان کی تعداد اور تحدید کی تحقیق، اور ان سے فقہی احکام
کا استخراج بھی فرمایا، اس طرح یہ رسالہ اس موضوع پر کافی و شافی بن گیا، اور اس کو
اس موضوع پر ایک چھوٹا سا دائرۃ المعارف کہا جاسکتا ہے۔[1]

اسی طرح "خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی" جیسی اہم بالشان اور بابرکت
کتاب اس طرح تالیف ہوئی کہ دہلی کے دو یا تین دن کے قیام میں جب بذل المجہود
کے پروفوں کے دیکھنے سے فرصت ملتی، اس کی تالیف میں مشغول ہوجاتے، ۱۳۴۲ھ میں
اس کی تالیف شروع ہوئی، اور جمادی الثانیہ ۱۳۴۴ھ شب جمعہ میں پوری ہوگئی۔[2]

ان دونوں کتابوں کے برخلاف جو بہت مختصر عرصہ اور کسی بڑے کام کے درمیان
کی فرصتوں اور وقفوں کے درمیان لکھی گئیں، شیخ کی وہ تصنیفات بھی ہیں جن کو انھوں نے
طویل عرصہ کے انہماک، مطالعہ اور تحقیق سے مرتب فرمایا، ان میں سب سے اہم بالشان کتاب

---

[1] یہ رسالہ خوبصورت عربی ٹائپ میں چھپا، ابتداء میں شیخ کے حکم سے راقم سطور کا بسیط مقدمہ بھی ہے
بعض عربی رسائل میں اس پر بہت اچھا تبصرہ نکلا۔ [2] آپ بیتی ج ۲ ص ۱۳۱

پھر متفرق فوائد وقواعد اور ہدایات وتوجیہات ہیں۔

"لامع الدراری" (جو اصلاً حضرت گنگوہیؒ کی تقریر بخاری اور مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کے حواشی کا مجموعہ ہے) شیخ کے اضافوں اور تشریحات کی وجہ سے حدیث کے طالب علموں اور مدرسین کے لئے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ بن گیا ہے اس سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی قدر اہل درس ہی کرسکتے ہیں کتاب کے شروع میں بڑی تختی کے ایک سو بیاون صفحے کا ناضلانہ مقدمہ ہے جس میں امام بخاری اور ان کی نادر روزگار "الجامع الصحیح" کے مختلف گوشوں، مباحث ومسائل پر مبسوط کلام ہے اور اس میں وہ معلومات، فوائد ونکات جمع کردیئے گئے ہیں، جو اصول ورجال، اور تذکروں کے ہزاروں صفحات میں منتشر ہیں، بلکہ مراجب کتب حدیث الواب حدیث تقریر واجتہاد، اور احناف کے دفاع کے سلسلہ کی وہ تحقیقات بھی جمع کردی گئی ہیں، جن سے یہ مقدمہ طالبین علم حدیث بالخصوص حنفی المسلک علماء کے لئے ایک اچھی بیاض (علمی کشکول بن گیا ہے) اس میں شیخ کی بعض ذاتی تحقیقات ان کے طویل درس حدیث کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ بھی آگیا ہے پہلی جلد اس بڑی تختی پر بہ مقدمہ کے پانچ سو بارہ صفحات پر تمام ہوئی ہے دوسری جلد بھی اسی سائز پر اتنے ہی صفحات پر تمام ہوئی ہے اور کتاب الجہاد تک پہونچی ہے۔

اسی طرح ان کا رسالہ "الابواب والتراجم للبخاری" ان کے تحقیقی ذوق، اپنے شائخ حدیث سے محبت، اور ان کے علوم کی حفاظت کا نمونہ ہے، یہ رسالہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے رسائل وتحقیقات کا مجموعہ ہونے کے علاوہ ابواب وتراجم کے سلسلہ میں ان اصول کو

قواعد بخاری سے جو حافظ ابن حجر، قسطلانی، حافظ عینی کے شرح میں آئے ہیں، پھر ان میں ان اصول و قواعد کا اضافہ کیا ہے جو ان کے ذوق تحقیق اور طویل اشتغال و بحث و تامل کا نتیجہ ہیں، اس طرح ان اصول و قواعد کلیہ کی تعداد ستر تک پہونچ گئی ہے ہمارے علم میں اتنا احتواء کسی کتاب میں نہیں کیا گیا" (الخ۔ عن ادلتہ) جو لوگ جانتے ہیں کہ بخاری کے ابواب و تراجم میں کتنے لطائف و نکات اور دقائق شامل ہیں، اور اساتذہ و مدرسین کو اس سلسلہ میں کیا مشقت و ان سے سر کرنا پڑتا ہے، وہ اس کتاب کی افادیت و اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

یہ چار کتابیں جو سب فن حدیث اور اس کے امہات کتب سے تعلق رکھتی ہیں، شیخ کو اپنے عہد کا (کم از کم علوم حدیث میں) عظیم مصنف بنانے اور اس کے محققین میں شامل کرنے کے لئے کافی ہیں[1]۔

اسی طرح حضرت گنگوہیؒ کی ترمذی کی تقریرات پر (جو شیخ کے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے قلم بند و مرتب کی تھیں) ان مزید فوائد کا اضافہ کیا جو دوسری شروح حدیث میں پائے جاتے تھے، اور کتاب پر مفید حواشی چڑھائے جن میں بہت سی نادر علمی تحقیقات و تنقیحات آگئی ہیں، اور جو طویل عرصہ تک درس حدیث اور اشتغال بکتب الحدیث سے ان کے ذہن میں آئے۔

شیخ کا یہ تصنیفی ذوق اور حدیث کی خدمت و اشاعت کا جذبہ ان پر اتنا غالب تھا کہ بعض اوقات وہ اس کے مقابلہ میں حالات سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے

---

[1] چاروں کتابوں پر امام کے قلم سے عربی میں مفصل مقدمے ہیں، ان میں ان کتابوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

اور بڑی سے بڑی ضرورت کو پس پشت ڈال دیتے، ناچیز کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

"۱۳۶۷ھ میں میں نظام الدین میں محبوس تھا، اور جو حالات تھے آپ کو یاد ہوں گے، ان حالات میں واپسی کا بالکل ارادہ نہیں تھا، مولوی نصیر اللہ نے میرے ساتھ ایک ہوشیاری برتی، مجھے یہ لکھا کہ ایک کاتب مل گیا ہے، اوجز جلد چہارم کی کتابت شروع کرادی ہے، اس کی طباعت پہلے سے شروع تھی، مگر تقسیم کے ہنگامہ میں کاپیاں بھی ضائع ہو گئی تھیں، اور کاغذ جو بڑی مقدار میں خریدا ہوا تھا، خرد برد ہو گیا تھا، اس خط کے پیچھے ہی میں نے عزیز مولوی یوسف مرحوم سے اپنی واپسی کا خیال ظاہر کیا، مجھے اس مرحوم کا یہ فقرہ اتنا چبھ رہا ہے کہ بھائی جی ہمیں اس حال میں چھوڑ کر جاویں گے؟ اور میرا یہ روکھا جواب کہ اب حالات قابل اطمینان ہو چلے ہیں، اب ٹھہرنا اوجز کی وجہ سے بہت مشکل ہے، یہ لمبی کہانی ہے، مگر جب خیال آجاتا ہے بہت ہی طبیعت بے چین کر دیتا ہے، سہارنپور پہنچ کر معلوم ہوا کہ صرف نصیر صاحب کی ہوشیاری تھی، کاتب وغیرہ کوئی نہیں تھا۔"[1]

تاریخی اور تحقیقی ذوق

حدیث و علوم حدیث شیخ کا اصل ذوق، موضوع، اور محنت و تحقیق کا میدان تھا، اور اس کو وہ تقرب الی اللہ و تقرب الی الرسولؐ کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے

[1] مکتوب مورخہ یکم شوال، از مدینہ منورہ۔

اور اس کو انھوں نے اپنا شعار و دثار بنا لیا تھا یہاں تک کہ شیخ الحدیث کا لقب ان کے نام کا جزو لازم اور ان کے مقام اور اس سے زیادہ مشہور ہو گیا تھا، اور ان کو یہ کہنے کا حق تھا۔

مااٰنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

لیکن اسی کے ساتھ ان کو تاریخی اور تحقیقی ذوق بھی تھا، جو اس وقت قدیم مدارس عربیہ و دینیہ میں کسی کو خال خال ہی ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے روزنامچے لیا اور اس کتاب میں جس کو تاریخ کبیر کے نام سے موسوم کرتے تھے اہم واقعات، سنین وفات، اور حوادث قلم بند کرتے رہتے تھے، جن سے بعض مرتبہ ایسی معلومات حاصل ہو جاتی تھیں جن کا دستیاب ہونا مشکل تھا۔

اس تاریخی ذوق، اور اپنے مادر علمی مدرسہ مظاہر علوم سے محبت و تعلق کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۲۵ھ میں انھوں نے تاریخ مظاہر لکھی[1] اس میں مدرسہ مظاہر علوم کے قیام و ترقی، بانیوں اور ذمہ داروں کے اصول و طریق کار، اساتذہ و مدرسین کے اخلاص و انہماک، انتظامی اور تدریسی تغیرات اور کتب درسیہ وغیرہ کی ایسی تفصیلات و جزئیات آ گئی ہیں، جو کم مدارس کے متعلق محفوظ ہوئی ہوں گی، کتاب کی ضخامت ۱۶۲ صفحات ہیں، شیخ کا مدرسہ سے ایسا تعلق، اور اس کے حالات سے اتنی واقفیت و شیفتگی رہی ہے کہ اس کے متعلق یہ مصرعہ لکھنا صحیح ہو گا کہ:

داستان فصل گل خوش می سراید عندلیب

ان کے اس تاریخی ذوق و تحقیق کی آئینہ دار چند کتابیں اور ہیں، ایک

---

[1] یہ کتاب عرصہ کے بعد ۱۳۲۹ھ میں طبع ہوئی۔

حجاز کے زمانۂ قیام میں جب وہ چند در چند معذوریوں اور کثیر عوارض میں مبتلا تھے انھوں نے فضائل زبان عربی پر ایک رسالہ لکھوانا شروع کر دیا، اس کی ابتداء ۱۵؍ صفر ۱۳۹۳ھ قبیل ظہر مسجد نبوی میں ہوئی[1]۔ اس رسالہ کی تصنیف میں ان کو ایسا انہماک ہوا اور وہ ذہن و دماغ پر ایسا مستولی ہو گیا کہ انھوں نے مدینہ طیبہ سے اس ناچیز کے نام ایک خط لکھا جس سے اس کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے:-

اس کے خطوں کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبار انتظار

"ایک نہایت اہم ضروری مضمون پانچ چھ خطوں میں لکھوا چکا ہوں، وہ یہ کہ مجھے عربی زبان کی فضیلت پر ایک رسالہ لکھنے کا خیال چار ماہ سے ہو رہا ہے، یہ تو یاد نہیں کہ اس کا پس منظر بھی آپ کو لکھوا چکا ہوں یا نہیں، مگر اس مضمون کی کوئی کتاب یہاں نہیں ملتی جس میں روایات حدیث ہوں، تقریباً دو ماہ ہوئے جب آپ کی آمد کی پہلی خبر سنی تھی، اس وقت میں نے دو تین خط لکھوائے تھے، اس مضمون کے کہ آپ کے یہاں کچھ رسائل ندوہ میں یا آپ کے پاس ہوں تو اپنے ہمراہ لیتے آویں اور ہمراہ ہی واپس لیتے جائیں، نیز عزیزان رابع و واضح کو بھی یہ پیام آپ کے خط میں لکھوایا تھا کہ کسی آیت کی تفسیر میں درّ منثور یا کسی اور تفسیر میں روایات ہوں تو وہ تلاش کر کے اس کے حوالے بھیج دیں، تو میں دوستوں سے اس کتاب کو تلاش کروا لوں[2]۔"

---

[1] کتاب کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محرک ایک خواب تھا جس میں اشارۂ نبوی شامل تھا۔

[2] ۱۰؍ فروری ۱۹۷۳ء۔

فضائل وحکایات کے رسائل

یوں تو شیخؒ کی کل مطبوعہ وغیر مطبوعہ تالیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہے[1] لیکن ان تصنیفات میں حکایات صحابہؓ اور کتب فضائل کو تبلیغی جماعتوں کے نصاب میں شامل ہونے اور افادۂ عام کی وجہ سے جو مقبولیت وشہرت حاصل ہوئی اور ان سے امت کے ایک بڑے طبقہ کو جو فائدہ پہونچا اس کی نظیر کم از کم اردو کی دینی ودعوتی کتابوں میں ملنی مشکل ہوگی، بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مطبوعہ نسخوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے پھر ان سے جو دینی وعملی نفع پہونچا اس کے بارے میں ایک ممتاز معاصر عالم کا یہ بہت مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے ذریعہ ہزاروں بندگان خدا ولایت کے درجہ تک پہونچ گئے۔

ان کتابوں میں حکایات صحابہؓ کو خاص مقام حاصل ہے، جو اپنی تاثیر وافادیت میں خاص امتیاز رکھتی ہے، یہ کتاب حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کی فرمائش پر لکھی گئی، وہ عرصے سے شیخؒ سے اس کا تقاضہ فرما رہے تھے کہ حضرات صحابہؓ کے احوال سے ان کو عشق تھا، یہ شیخؒ کا تدریسی وتصنیفی انہماک اس کا موقع نہیں دیتا تھا کہ اچانک ۱۳۵۷ھ میں شیخؒ کو سخت نکسیر کا دورہ پڑا، ڈاکٹروں نے چند ماہ کے لئے دماغی کام سے روک دیا گیا وہ بغیر کام کئے رہ نہیں سکتے تھے اس زمانہ میں انھوں نے حکایات صحابہؓ لکھی، جو

---

[1] ملاحظہ ہو آپ بیتی نمبر ۶ کا آخری حصہ از صفحہ ۲۲۳ تا ۲۴۴ اس میں خود حضرت شیخؒ کی زبان سے تالیفات ورسائل کا تعارف، موضوع اور ان کی ابتداء وانتہاء کی تاریخ ہے سوانح کے اس باب میں تصنیفات پر صرف اجمالی تبصرہ ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۱۲؍شعبان ۱۳۶۱ھ کو مکمل ہوئی، یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی، تبلیغی جماعت کے نصاب کا اہم جزو ہونے کے علاوہ وہ دینی و عوامی حلقوں کی مقبول ترین تصانیف و مؤثر کتاب ہے، زبان سلیس و شیریں، طرز بیان دل نشین، قوت تاثیر صرف وقتی نہیں بلکہ انقلاب انگیز ہے۔

شیخ کا بڑا کارنامہ اور ان کی سعی مشکور فضائل کے رسائل و تصنیفات کی ترتیب و تالیف ہے، ہندوستان میں تبلیغی جماعت کے داعی اول و بانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا یہ اعلیٰ درجہ کا تفقہ فی الدین، فراست ایمانی اور دین کے عمیق فہم کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے مسلمان کی زندگی و عمل میں فضائل کی اہمیت و قوت اور سحر انگیزی کا ادراک کیا اور انھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ یہ طاقت زندگی کے پہیہ کو تیزی کے ساتھ حرکت دیتی ہے، انھیں کے دم سے دنیا کا بازار گرم اور اس کی رونق قائم ہے، وہ نفع پر یقین ہے یہی وہ یقین ہے کہ جو کسان کو سخت سردی کے موسم میں اپنے بستر سے اٹھا دیتا ہے اور اندھیرے منہ کھیت میں پہنچا دیتا ہے اور لو کے تھپیڑوں اور سورج کی تپش میں کھیت جوتنے اور سینچنے جانے کی قوت بخشتا ہے، یہی یقین ایک تاجر کو گھر بار، راحت و آرام چھوڑ کر اپنے کاروبار میں مشغول ہونے پر آمادہ کرتا ہے، وہی یقین ایک فوجی کے لئے موت کو آسان اور زندگی کو دشوار بنا دیتا ہے جو پھر اس کو اپنی محبوب اولاد کو چھوڑ کر بے تکلف میدان جنگ میں چلے جانے پر آمادہ کرتا ہے، وہ نفع کا یقین اور منصب میں کسی فائدہ کی توقع ہے اور یہی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی کی چکی گھومتی ہے۔

لیکن ان یقینوں کے سوا ایک یقین اور ہے جو اپنی انقلاب آفرینی اور قوت تاثیر میں اس یقین سے کہیں بڑھ کر ہے جس کی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، یہ ان منافع کے حصول کا یقین ہے جس کی خبر انبیاء کرام اس دنیا میں لے کر آئے اور روحانی اور تمام

آسمانی صحیفوں نے اس کی تصدیق اور تلقین کی جس کو ہم خدا کی خوشنودی اور دنیا و آخرت میں احسان کے بدلے سے تعبیر کرسکتے ہیں۔[1]

فضائل کی احادیث میں اسی کو "ایمان و احتساب" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی کو مومن کے عمل کے لئے سب سے بڑی قوت محرکہ ہونا چاہئے۔[2]

مولانا محمد الیاس صاحب فرماتے تھے کہ فضائل کا درجہ مسائل سے پہلے ہے فضائل سے اعمال کے اجر پر یقین ہوتا ہے جو ایمان کا مقام ہے اور اس سے آدمی عمل کے لئے آمادہ ہوتا ہے مسائل معلوم کرنے کی ضرورت کا احساس تو تب ہی ہوگا جب وہ عمل پر تیار ہوگا اس لئے ہمارے نزدیک فضائل کی اہمیت زیادہ ہے۔[3]

شیخ نے اس ضرورت کی تکمیل کے لئے "فضائل نماز" "فضائل رمضان" "فضائل قرآن" "فضائل ذکر" "فضائل حج" "فضائل صدقات" "فضائل تبلیغ" اور "فضائل درود" لکھیں، ان میں سے اکثر کتابیں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے ایماء و حکم سے لکھی گئیں، "فضائل قرآن" اور "فضائل درود" شاہ محمد یٰسین صاحب نگینوی (یکے از خلفاء حضرت گنگوہی) کی فرمائش سے لکھی گئیں "فضائل حج" ۲۰ شوال ۱۳۶۶ھ کو شروع کی، کتاب میں بڑے شوق انگیز واقعات اور ذوق انگیز اشعار ہیں، حج کے مقصد و روح سے خاص مناسبت

۱؎ ارکان کے دو بیان کی عبارت مصنف کی کتاب "ارکان اربعہ" کے باب "روزہ" سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو عنوان "فضائل اور اس کی قوت و تاثیر" صفحہ ۲۶۵

۲؎ صوم و قیام رمضان کے سلسلہ میں احادیث میں واضح طور پر یہ الفاظ آئے ہیں "من صام رمضان ایمانا واحتسابا ... من قام لیلۃ القدر ایمانا واحتسابا (بخاری)

۳؎ ملفوظات حضرت دہلوی۔

رکھتے ہیں، اس لئے کتاب بڑی مؤثر ہے، اس کے ساتھ شیخ کا ذوقِ شعری اور حسنِ انتخاب بھی نمایاں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عنانِ قلب و قلم دونوں ہاتھ سے چھوٹ گئے ہیں، مدینہ طیبہ حاضری کے آداب و اشواق کو دل کھول کر لکھا ہے جس سے کتاب "کاروانِ مدینہ کی حدی خوان" بن گئی، اسی طرح "فضائلِ صدقات" میں اہلِ قلوب اور رجالِ آخرت کے ایثار و توکل، تحقیرِ دنیا اور شوقِ آخرت کے ایسے مؤثر واقعات جمع کر دیئے ہیں، جن سے مال و متاعِ دنیا کی حقارت، آخرت کی عظمت و اہمیت اور شوقِ لقاء پیدا ہوتا ہے، غرض یہ سب کتب رسائل و فضائل بڑے مؤثر، دل پذیر اور شوق انگیز ہیں۔

شیخ کی تصنیفی جامعیت

عام طور پر جو لوگ علمی اور تحقیقی طرز کے عادی ہوتے ہیں وہ خالص دعوتی و اصلاحی اور عام فہم طرز پر تصنیف و تالیف کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے، اور جو دوسرے طرز کے عادی ہو جاتے ہیں وہ پہلے طرز میں اس کے آداب و معیار کو قائم نہیں رکھ سکتے، لیکن شیخ کی دونوں طرز کی تصنیفات مؤثر اور کامیاب ہیں، پہلے طرز کا نمونہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، اوجز المسالک، مقدمہ لامع الدراری، حجۃ الوداع و عمرات النبی صلے اللہ علیہ وسلم اور علمی و تدریسی رسائل "جزء اختلافات الصلاۃ" "جزء اختلاف الائمہ" اور "جزء المبہمات فی الاسانید والروایات" ہیں[1] دوسرے طرز کا نمونہ "حکایاتِ صحابہ" اور فضائل کے رسائل اور کتابیں ہیں، اور ان دونوں طرزوں کی جامع "شمائلِ ترمذی کا ترجمہ و شرح خصائلِ نبوی" ہے، اس طرح شیخ بیک وقت مصنف و محقق بھی نظر آتے ہیں،

---

[1] افسوس ہے کہ یہ سب رسائل غیر مطبوعہ ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی ملفوظ ۱۴۹-۱۵۰

شارح حدیث اور مؤرخ بھی معلوم ہوتے ہیں اور خالص داعی، مذکر اور مختلف طبقات امت کے ان کی زبان میں مخاطب کرنے والے مصلح بھی نظر آتے ہیں۔

"وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء"

باب یازدہم

ارشادات و افادات

اس حقیقت کے پیش نظر کہ علماء دین و مشائخ روحانی کو اپنی زندگی کے حالات و سوانح سے زیادہ دین کی صحیح نسبت و ہدایات اپنے متوسلین کے لئے چھوڑ اور اپنی زندگی کے تجربات اور مخلصانہ مشوروں کی اشاعت کا اہتمام ہوتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر وہ ان اعلیٰ مراتب تک پہونچے اور جن سے فائدہ اٹھا کر اور ان پر کاربند ہو کر دوسرے بھی دینی و روحانی ترقیات حاصل کر سکتے ہیں اور بہت سے خطرات اور غلطیوں سے بچ سکتے ہیں، ہم یہاں حضرت شیخ کے چند ملفوظات نیز ان کی مقبول و مشہور دو تصنیفات و رسائل کے اقتباسات پیش کرتے ہیں کہ جن ناظرین کو ان کتابوں کے پڑھنے کا موقع نہ ملا ہو وہ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ تصنیفات کے اقتباسات کے انتخاب و نقل کے سلسلہ میں ہم عزیز گرامی مولوی عتیق احمد صاحب بستوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ممنون ہیں۔

چند ملفوظات

تصوف کی حقیقت دو لفظوں میں

فرمایا کہ ایک مرتبہ دس بجے صبح کو میں اوپر اپنے کمرے میں نہایت مشغول تھا، مولوی نصیر نے اوپر جا کر کہا کہ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی آئے ہیں رائے پور جا رہے ہیں، حضرت سے مصافحہ کرنا ہے۔ میں نے کہا جلدی بلا دے، مرحوم اوپر چڑھے اور زینے پر چڑھتے ہی سلام کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا رائے پور جا رہا ہوں اور ایک سوال آپ سے کر کے جا رہا ہوں، اور یہ سوال صبح واپسی پر ہے، اس کا جواب آپ سوچ رکھیں، واپسی میں جواب لوں گا: "یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے؟" میں نے مصافحہ کرتے کرتے جواب دیا "صرف تصحیح نیت" اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتداء "انما الاعمال بالنیات" سے ہوتی ہے اور انتہا "ان تعبد اللہ کانک تراہ" ہے۔ میرے اس جواب پر سکتہ میں کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے دلی سے یہ سوچتا آ رہا ہوں کہ تو یہ جواب دے گا تو یہ اعتراض کروں گا، اور یہ اعتراض کرے گا تو یہ جواب دوں گا، اس کو تو میں نے سوچا ہی نہیں۔

"انما الاعمال بالنیات" سارے تصوف کی ابتداء ہے اور "ان تعبد اللہ کانک تراہ" سارے تصوف کا منتہا ہے، اسی کو نسبت کہتے ہیں، اسی کو یاد داشت کہتے ہیں، اسی کو حضوری کہتے ہیں ؎

حضوری گر ہمی خواہی ازو غائب مشو حافظ　　متی ما تلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

میں نے کہا مولوی صاحب سارے پاپڑ اسی کے لئے بیلے جاتے ہیں، ذکر بالجہر بھی اسی کے واسطے ہے مجاہدہ و مراقبہ بھی اسی کے واسطے ہے اور جس کو اللہ جل شانہ اپنے لطف وکرم سے کسی بھی طرح سے یہ دولت عطا کر دے اس کو کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔"

وقت کی قدر کی جائے

فرمایا: "اوقات بہت قیمتی ہیں، زندگی کا جو وقت مل گیا ہے اس کی قدر پہچانی چاہیئے حدیث میں آتا ہے" فلیتزود العبد من نفسہ لنفسہ ومن حیاتہ لموتہ ومن شبابہ لکبرہ ومن دنیاہ لآخرتہ" بندے کو چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے لئے اور زندگی میں موت سے پہلے اور نوجوانی میں اپنے بڑھاپے سے پہلے، اور اس دنیا میں آخرت سے پہلے زادِ راہ تیار کر لے۔

تیرا ہر سانس نخلِ موسوی ہے
یہ جزر و مد جواہر کی لڑی ہے"

عبودیت و اطاعت کا ثمرہ

فرمایا: "میرے دوستو! مالک کے سامنے جھک جاؤ تو ساری چیزیں تمہارے سامنے جھک جائیں گی، صحابہ کرام کے قصے معلوم ہیں، ایک مرتبہ افریقہ کے جنگل میں مسلمانوں کو چھاؤنی ڈالنے کی ضرورت پیش آئی، اور ایسے جنگل میں جہاں ہر قسم کے درندے اور موذی جانور بکثرت تھے، حضرت عقبہؓ امیر لشکر چند صحابہؓ کو ساتھ لے کر ایک جگہ پہونچے اور اعلان کیا "ایہا الحشرات والسباع نحن اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فارحلوا فانا

دیکھا کر ان کے حالات قابل رشک تھے مگر دوسروں پر تنقید و تحقیر نے انھیں گرا دیا۔ بہر حال اس نسبت سے اگر دوسری قسم کے معاصی مزاحم ہوئے تو معاملہ زیادہ سخت۔

بزرگوں کی ابتدا (دورِ مجاہدہ) کو دیکھنا چاہیئے

حضرت نے ارشاد فرمایا: ہمارے بزرگوں کا مقولہ ہے "جو ہماری انتہا کو دیکھے وہ ناکام اور جو ابتداء کو دیکھے وہ کامیاب" اس لئے کہ ابتدائی زندگی مجاہدوں میں گذرتی ہے، اور آخیر میں فتوحات کے دروازے کھلتے ہیں، اگر کوئی ان فتوحات کو دیکھ کر آخری زندگی کو معیار بنائے تو وہ ناکام ہو جائے گا۔"

مجاہدہ و قربانی ترقیِ روحانی کی شرط ہے

ارشاد فرمایا:۔ ؏

"رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ رگڑ جانے کے بعد

دیکھو حنا (مہدی) کی پتی جب رگڑ دی جائے تو وہ رنگین بنا دیتی ہے، اور اگر بغیر رگڑے ہوئے اس کے پتے رکھ دیئے جائیں تو کچھ نہ ہوگا، حضرت مدنیؒ فرماتے تھے کہ مسجد اجابت میں ذکر کرتا تھا، جی چاہتا تھا کہ اس کی دیواروں سے سر پھوڑ لوں۔

اظہار و حقیقت میں فرق

فرمایا:۔ ہم لوگ اپنی زبان اور اپنے قلم سے ناکارہ و سیہ کار لکھتے ہیں مگر یہ رسم ہے، ہم زبانی گھس جانے کے بجائے رگڑ جانے سے۔

بن گئی ہے اگر کسی تنظیم میں کوئی اعتراض کر دے تو حسن دماغ کھولنے لگتا ہے حالانکہ اگر سچ کی بات ہے تو اس پر ناگواری کیسی بلکہ اس کو ضرور ماننا چاہئے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں خصوصیت سے جو لوگ ذکر و اجازت یافتہ ہیں ان کے اخلاق ایسے ہونے چاہئیں کہ دوسروں کی ہدایت کا سبب بنیں نہ کہ الٹے ہٹنے کا اور متنفر ہونے کا۔

افراط و تفریط سے اجتناب

ارشاد فرمایا۔ حدیث میں آیا ہے کہ مُردوں کی برائیوں کے ساتھ ذکر نہ کرو بلکہ ان کی بھلائیوں کا تذکرہ کرو۔ ہم لوگ اس قدر افراط و تفریط میں مبتلا ہیں تعریف میں تو کسی کو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں اور کسی کو تحت الثریٰ میں پہونچا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ کرے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو، انصاف اختیار کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔"

ذکر الٰہی میں فتنوں سے حفاظت ہے

فرمایا۔ آج ہمارے مدارس میں سیاسی فضا اسٹرائک وغیرہ سب ایسی ہی تماشائی زندگی کی وجہ سے پیش آرہی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر زمین میں اللہ اللہ کہنے والے ختم ہو جائیں تو قیامت آجائے گی یہی حال مدرسوں کی بقا کا ہے اللہ کا نام خواہ کتنی ہی بے توجہی سے

لیا جائے اللہ کئے بغیر نہیں رہتا ہم لوگوں میں اخلاص نہیں رہا اللہ اللہ کرنے کے سلسلے کو بڑھاؤ، اللہ کا نام جہاں کثرت سے لیا جائے گا، وہاں فتنہ نہ ہوگا، اللہ کا ذکر حوادث و فتن میں سد سکندری ہے پہلے زمانہ میں دورۂ حدیث میں طلبہ کی ایک تعداد ذاکر ہوا کرتی تھی!!

اللہ سے تقرب حاصل کرنے کا راستہ آسان ہے

ارشاد فرمایا: حدیث میں آیا ہے "بہت سے پراگندہ و سر غبار آلود جن کو دروازوں سے دھکا دیا جاتا ہے اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کے قسم کی لاج رکھ لیتا ہے" آدمی ریاضت و مجاہدے سے یہ مقام حاصل کر سکتا ہے، دوسری حدیث میں آیا ہے "لا یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل الخ" آدمی نوافل کے ذریعہ برابر حق تعالےٰ کا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں، آگے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے بعد اس کے ہاتھ پیر سے جو کچھ صادر ہوتا ہے، وہ حق تعالےٰ کی مرضی کے موافق ہوتا ہے!!

اس کے بعد ارشاد فرمایا: اللہ جل شانہٗ کا راستہ بہت آسان ہے تجربہ بھی ہے اور لوگوں کو دیکھا بھی ہے ؎

بعلم اللہ راہ خدا ہیچ از دو قدم نیست
یک قدم بر نفس خود نہ دیگرے بر کوئے دوست

ارشاد فرمایا: بھائی دیکھو جو کچھ کرو اللہ کی مرضی کے موافق کرو اپنے جی و مرضی کے موافق نہ کرو، کچھ کر لو، رمضان المبارک میں اس کی مشق کرلو، ہمارے بزرگوں میں سے کوئی

یہ نہیں کہتا کہ ملازمت نہ کرو، دوکان نہ کرو۔[1]

اقتباسات و منتخبات

تصوف کی حقیقت

"تصوف میرے اکابر کا اہم ترین مشغلہ ہے ؎

در کفے جام شریعت، در کفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

کے سچے مصداق تھے یہ حضرات ایک جانب فقہ، حدیث اور علوم ظاہریہ میں اگر ائمہ مجتہدین اور ائمہ حدیث کے حقیقی جانشین اور سچے تبع تھے تو دوسری جانب تصوف کے ائمہ جنید و شبلی کے قدم بقدم، ان اکابر نے تصوف کو فقہ و حدیث کے ماتحت چلایا اور اپنے قول و عمل سے بتلا دیا کہ یہ مبارک فن حقیقت میں قرآن و حدیث ہی کا ایک شعبہ ہے اور جو رسوم و بدعات اس مبارک فن میں بعد زمانہ سے بڑھ گئی تھیں ان کو چھانٹ دیا، تصوف کو بعض ناواقفوں نے ظاہر شریعت کا مخالف نہیں تو علیحدہ ضرور بنا دیا، یا تو غلو ہے یا جہل۔

حقیقی تصوف کو جس کا دوسرا نام احسان ہے حضرت جبرئیل علیٰ نبینا و علیہ الصلاۃ والسلام نے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے

---

[1] منقول از "صحبتے با اولیاء" مرتبہ از مولوی تقی الدین ندوی مظاہری۔

دریافت کرکے یہ واضح کردیا کہ یہ شریعت ہی کی روح اور مغز ہے۔ اور حضرت جبرئیل کے اس سوال پر کہ احسان کیا چیز ہے سید الکونین نے اس پاک ارشاد سے ان تعبد اللہ کانک تراہ (احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت ایسی کرے گویا اس کو دیکھ رہا ہے)

احسان کے معنی اور تصوف کی حقیقت واضح کردی۔ عنوانات تو اس کے جو بھی اختیار کرلئے جاویں لیکن مرجع سب کا یہی حقیقت ہے ۔

[illegible]

انت الذی [illegible]

شاعر کہتا ہے کہ چاہے یہ شعر ہو کہ یہ سعدی کا نام لوں یا معروف معشوق رباب کا نام لوں ہر حیثیت سے مقصود تو ہی ہے اور تو ہی مطلوب ہے۔

یہ تو حقیقت ہے اس کے بعد جو چیزیں ذکر و شغل، مجاہدات و ریاضات یہ حضرات تجویز کرتے ہیں وہ درحقیقت یہ سب علاج ہیں، چونکہ سید الکونین صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے جتنا بعد ہوتا جاتا ہے اتنا ہی قلوب پر زنگ اور امراض روحیہ دلوں میں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ یونانی اطباء اور ڈاکٹر جدید امراض کے لئے تجربات پر قواعد سے دقیق اور نئی نئی چیزیں اور دوائیاں تجویز کرتے ہیں اسی طرح یہ روحانی اطباء بھی امراض کے لئے ہر شخص کے حال کے موافق اور ہر زمانہ کے موافق دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب جو حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہ کے اجل خلفاء میں ہیں ان کا ایک رسالہ تصوف اور نسبت صوفیہ مختصر اور قابل دید ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابو یحییٰ زکریا انصاری شافعی فرماتے ہیں کہ تصوف کی اصل حدیث جبرئیل ہے جس میں آیا ہے کہ ما الاحسان قال

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ" (الحدیث) چنانچہ تصوف احسان ہی کا نام ہے۔[1]

تصوف کا لب لباب

"تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علماء تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ "ھو علم" وہ ایسا علم ہے جس کے ذریعہ سے نفوس کا تزکیہ، اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں۔ جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے۔" اب آپ خود غور فرمایئے کہ اس میں سے کونسی چیز غلط ہے؟ نفس کا تزکیہ غلط ہے یا اخلاق کا تصفیہ بُرا ہے؟ ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے؟ یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بیکار ہے؟ اسی طرح تقویم اخلاق، تہذیب نفس، نیز نفس کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنالینا، ان امور میں کون سی شئ مقاصد شرع کے خلاف ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک شئ کتاب وسنت کے عین مطابق اور اللّٰہ ورسول صلے اللّٰہ علیہ وسلم کے منشا کو پورا کرنے والی ہے۔

غرض ہم جس تصوف کے اثبات کے قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں احسان کہتے ہیں، یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے، یا تعمیر الظاہر والباطن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ ایک بانظم و بااصول چیز ہے، اس میں مریدین کے لئے بھی شرائط ہیں اور شیخ کے لئے بھی اصول و آداب ہیں، جن کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لب لباب کہنا بجا ہے، اور جب ان شرائط و آداب کا لحاظ نہ کیا جائے، بلکہ غیر تصوف کو تصوف قرار دے دیا جائے تو پھر وہ طریق ہی نہیں جو ہمارا

---

[1] اکابر کا سلوک واحسان ۔ صفحہ ۱۸ ، ۱۶

موضوع بحث ہے اس لئے کہ ان کی خرابیوں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں
جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور اصل طریق کو نہیں قرار
دیا جا سکتا اب اگر آپ کو تصوف سے لفظ اس بنا پر چڑ اور انکار ہے کہ اس کا نام محدث
ہے تو اس میں تصوف ہی منفرد نہیں، نہ معلوم کتنی چیزیں اس وقت موجود ہیں کہ آپ کا
ان سے تعلق بھی ہے جو کہ ابتداء اسلام میں ان ناموں سے معروف نہ تھیں۔ میں کہتا ہوں
کہ اگر اس کا نام بدعت ہے تو مسمّیٰ تو اس کا بدعت نہیں آپ اس کو احسان سے
تعبیر کر لیجئے علم اخلاق اس کا نام رکھ لیجئے اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو
اس کو محسن، مقرب اور مخلص کہہ لیجئے، وہ احسان محسن متقی و مخلص کے ذکر سے قرآن
بھرا ہوا ہے، حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہوا ہے۔[1]

مسلمانوں کی نجات و ترقی کا واحد راستہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس وقت شام تشریف لے جا رہے تھے راستہ
میں ایک جگہ کیچڑ کا یا پانی آ گیا، آپ اونٹ پر سے اتر پڑے اور موزے نکال کر شانہ پر رکھ لئے
اور اس میں گھس کر اونٹ کی نکیل ہاتھ میں پکڑ لی وہ ساتھ ساتھ تھے حضرت ابو عبیدہ بن
جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا آپ نے یہ ایک ایسی بات کی کہ شام والے تو اس
کو بڑی ذلت کی چیز سمجھتے ہیں میرا دل نہیں چاہتا کہ اہل شام آپ کو اس حالت پر دیکھیں
آپ نے ان کے سینہ پر ایک ہاتھ مارا اور ارشاد فرمایا کہ ابو عبیدہ تمہارے علاوہ کوئی دوسرا
ایسی بات کہتا تو میں عبرت انگیز سزا دیتا، ہم لوگ ذلیل تھے حق تعالیٰ جل شانہ نے

---

[1] اکابر کا سلوک و احسان ص ۔۔۔

اسلام کی بدولت عزت عطا فرمائی ہے اب جس چیز سے اللہ نے عزت دی اس کے سوا کسی چیز کے ساتھ عزت ڈھونڈیں گے تو اللہ ہم کو ذلیل کر دیں گے (مستدرک علی الحاکم) حقیقۃً مسلمانوں کے لئے اصل عزت اللہ کے یہاں کی عزت ہے، دنیا اور دنیا والوں کے نزدیک اگر ذلت ہوئی بھی تو کیا اور کے دن کی ہے۔

اگر سمجھیں مجھے محروم وقار و تمکین
وہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ کی نافرمانیوں کے ساتھ لوگوں میں عزت تلاش کرتا ہے اس کی تعریف کرنے والے اس کی مذمت کرنے والے بن جاتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے ترقی کی راہ، عزت کی راہ، زندگی اور دنیا میں آنے کی غرض صرف اللہ کی رضا اس کی مرضیات پر عمل ہے اس کے سوا کچھ نہیں، اگر عزت ہے تو یہی ہے منفعت ہے تو یہی ہے عبرت ہے کہ مسلمانوں کے لئے اللہ کے پاک کلام اور اس کے رسول کے سچے ارشادات میں علوم و حکمت دارین کی فلاح و ترقی کے اسباب اور خزانے بھرے ہوئے ہیں لیکن وہ ہر بات میں دوسروں پر نگاہ رکھتے ہیں، دوسروں کا پس خوردہ کھانے کے درپے رہتے ہیں کیا یہ چیز انتہائی بے غیرتی اور اللہ اور اس کے پاک رسول کے ساتھ اجنبیت اور منافرت کی نہیں ہے کیا اس کی مثال اس بیمار کی سی نہیں جس کے گھر میں ایک مرجع الخلائق حکیم ایک حاذق ڈاکٹر موجود ہو اور وہ کسی اناڑی ڈاکٹر سے علاج کرائے۔

الغرض مسلمان کے لئے صلاح و فلاح صرف اتباع مذہب اسوۂ رسول اور سلف صالحین کے طریقے میں منحصر ہے یہی آخرت میں کام آنے والی چیز ہے یہی دنیا میں ترقیات کا سبب ہے، اسی پر عمل کر کے پہلے لوگ بام ترقی پر پہونچے تھے جن کے احوال

واقعات آنکھوں کے سامنے ہیں اور کوئی تاریخ سے واقف شخص اس چیز سے انکار نہیں کر سکتا، اس کے خلاف میں مسلمانوں کے لیے ہلاکت ہے بربادی ہے آخرت کا خسارہ ہے دنیا کا نقصان ہے تجویزیں جتنی چاہے کر لی جائیں ریزولیشن جتنے چاہے پاس کر لئے جائیں اخبارات کے مقالے جتنے چاہے لکھ لئے جائیں اور مزہ لے کر پڑھ لئے جائیں سب بے سود ہیں بیکار ہیں مسلمان کی ترقی و فلاح کا واحد راستہ صاحبِ اسوہ پیغمبر ہے اور اسلامیات کا اہتمام ہے اس کے سوا دوسرا راستہ منزل مقصود کی طرف ہے ہی نہیں۔

یہاں ایک اور چیز پر بھی غور کرتے چلو آج اسلام کو مسخ کر دیا جائے اس کے سارے احکام کو مولویانہ اسلام راہبانہ مذہب ملائیت تنگ نظری کہہ دیا جائے مگر جن اسلاف نے ہزاروں فتح کئے تھے لاکھوں کروڑوں آبادیوں کو مسلمان کر کے اسلام کی حکومت وہاں قائم کی تھی وہ اسی مولویانہ اسلام کے عامل تھے اور ملاؤں سے زیادہ تنگ نظر تھے وہاں دین سے ایک انچ ہٹنا بھی ہلاکت شمار کیا جاتا تھا، وہاں زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر قتال کیا جاتا تھا، وہاں شراب کو حلال سمجھ کر پینے پر قتل کیا جاتا تھا اور حرام سمجھنے کے باوجود پینے پر کوڑے لگائے جاتے تھے، وہ حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے نماز کو ایسا منافق چھوڑ سکتا ہے جس کا نفاق بالکل واضح ہو یعنی عام منافقین کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ نماز کو چھوڑ سکیں، وہاں جب کوئی اہم مشکل اور گھبراہٹ کی بات پیش آتی تھی تو فوراً نماز کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔[1]

---

[1] مسلمانوں کی پریشانیوں کا بہترین علاج ص۵۳ تا ۵۵ مختصراً۔

ایک مخلصانہ نصیحت

"میری ایک نصیحت بہت غور سے سنو! ہمیشہ ایسی چیزوں پر لب کشائی کرو جس کے پورے مالہ وما علیہ پر عبور ہو، دو شخصوں کے درمیان میں محاکمہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ان دونوں کے پورے دلائل پر عبور ہو۔ البتہ کسی شرعی منصوص کے خلاف کوئی چیز ہو تو اس میں کسی کی بھی رعایت نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی قول معتبر نہیں بلکہ فقہاء وسلف کے منصوص اقوال کے خلاف بھی مقلد کے لئے کوئی گنجائش نہیں لیکن جہاں مسئلہ استنباط سے تعلق رکھتا ہو، نصوص شرعیہ ہر ایک کے ساتھ ہوں وہاں جلدی سے ذہنی معقولات کر کے فوراً نکیر کر دینا حماقت ہے۔ میں تم کو بڑے زور سے روکتا ہوں کہ اس میں پر انکار کرنے میں کبھی بھی جلدی نہ کرنا، بہت غور و فکر اور تدبر کے بعد لب کشائی کرنا جہاں تک ممکن ہو اس سے گریز کرنا۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جن کو عمر ثانی کہا جاتا ہے انھوں نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آپس کی لڑائی میں کس قدر بہترین فیصلہ کیا "تلک دماء طهر اللہ منها ایدینا فلا نلوث بها السنتنا" ان خونوں سے اللہ جل شانہ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا تو ہم اپنی زبان کو کیوں ان سے آلودہ کریں۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان اعلیٰ وارفع ہے دوسروں کو ان پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہاں لب کشائی سے بچنے والے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں جو جلیل القدر تابعی ہیں۔ حضرت خضر، حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہما السلام کا قصہ مشہور ہے قرآن پاک میں مفصل مذکور ہے، متعدد احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ

اللہ جل شانہ حضرت موسیٰ (علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر رحم فرمائیں اگر وہ سکوت کرتے تو اور بھی عجائبات حضرت خضر کے کارناموں کے معلوم ہوتے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے کہ امور تین طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا رشد (ہدایت) ہونا کھلا ہوا ہو ان کا اتباع کرو دوسرے وہ امور ہیں جن کا گمراہی ہونا کھلا ہوا ہو ان سے اجتناب کرو تیسرے وہ ہیں جن میں اختلاف ہو ان کو ان کے عالم کے حوالہ کرو (رواہ الطبرانی ورجالہ موثقون کذا فی مجمع الزوائد)۔

حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص فتویٰ دینے پر زیادہ جری ہے وہ جہنم پر زیادہ جری ہے (دارمی) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص ہر استفتاء کا جواب دے وہ مجنون ہے[1] (دارمی)

ایک ایمان افروز واقعہ

حضرت سعید بن المسیب مشہور تابعی ہیں بڑے محدثین میں شمار ہیں ان کی خدمت میں ایک شخص عبد اللہ بن ابی وداعۃ کثرت سے حاضر ہوا کرتے تھے ایک مرتبہ چند روز حاضر نہ ہو سکے کئی روز کے بعد جب حاضر ہوئے تو حضرت سعید نے دریافت فرمایا کہاں تھے عرض کیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اس کی وجہ سے مشاغل میں پھنسا رہا۔ فرمایا کہ ہم کو خبر نہ کی ہم بھی جنازہ میں شریک ہوتے تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھ کر آنے لگا فرمایا دوسرا نکاح کر لیا؟ میں نے عرض کیا حضرت مجھ سے کون نکاح کرے گا دو تین

[1] الاعتدال فی مراتب الرجال ص۲۳ ج۲۵

آنے کی میری حیثیت ہے آپ نے فرمایا ہم کردیں گے اور یہ کہہ کر خطبہ پڑھا اور اپنی بیٹی کا نکاح نہایت معمولی مہر تقریباً دو درہم یا تین درہم کے عوض کر دیا کہ اتنی مقدار مہر کی ان کے نزدیک جائز ہوگی جیسا کہ بعض اماموں کا مذہب ہے حنفیہ کے نزدیک ڈھائی روپئے سے کم جائز نہیں، نکاح کے بعد میں اٹھا اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ مجھے کس قدر مسرت تھی خوشی میں سوچ رہا تھا کہ رخصتی کے انتظام کے لئے کس سے قرض مانگوں کیا کروں اسی فکر میں شام ہو گئی میرا روزہ تھا مغرب کے وقت روزہ افطار کیا نماز کے بعد گھر آیا چراغ جلایا روٹی اور زیتون کا تیل موجود تھا اس کو کھانے لگا کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے پوچھا کون ہے؟ کہا سعید، میں سوچنے لگا کہ کون سعید ہے حضرت کی طرف میرا خیال بھی نہیں گیا کہ چالیس برس سے اپنے گھر یا مسجد کے سوا کہیں آنا جانا تھا ہی نہیں باہر آ کر دیکھا کہ سعید بن المسیبؓ ہیں میں نے عرض کیا آپ نے مجھے نہ بلا لیا فرمایا میرا ہی آنا مناسب تھا میں نے عرض کیا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا مجھے یہ خیال آیا کہ اب تمہارا نکاح ہو چکا ہے تنہا رات کو سونا مناسب نہیں اس لئے تمہاری بیوی کو لایا ہوں یہ فرما کر اپنی لڑکی کو دروازے کے اندر کر دیا اور دروازہ بند کر کے چلے گئے وہ لڑکی شرم کی وجہ سے گر گئی میں نے اندر سے کواڑ بند کئے اور وہ روٹی اور تیل جو چراغ کے سامنے رکھا تھا وہاں سے ہٹا دیا کہ اس کی نظر نہ پڑے اور مکان کی چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو آواز دی لوگ جمع ہو گئے تو میں نے کہا کہ حضرت سعیدؓ نے اپنی لڑکی سے میرا نکاح کر دیا ہے اور اس وقت وہ خود ہی اس کو پہونچا گئے ہیں سب کو بڑا تعجب ہوا کہنے لگے واقعی وہ تمہارے گھر میں ہے؟ میں نے کہا ہاں! اس کا چرچا ہوا میری والدہ کو خبر ہوئی وہ بھی اسی وقت آ گئیں اور کہنے لگیں کہ اگر تین دن تک تو نے چھیڑا

تو تیرا منہ نہ دیکھوں گی، ہم تین دن میں اس کی تیاری کر لیں۔ تین دن کے بعد جب میں اس لڑکی سے ملا، تو دیکھا نہایت خوبصورت قرآن شریف کی بھی حافظ اور سنت رسول سے بھی زیادہ واقف شوہر کے حقوق سے بھی زیادہ باخبر، ایک مہینہ تک نہ تو حضرت سعیدؒ میرے پاس آئے نہ میں ان کی خدمت میں گیا، ایک ماہ کے بعد میں حاضر ہوا تو وہاں مجمع تھا میں سلام کر کے بیٹھ گیا جب سب چلے گئے تو فرمایا اس آدمی کو کیسا پایا؟ میں نے عرض کیا نہایت بہتر ہے کہ دوست خوش ہوں دشمن جلیں فرمایا اگر کوئی بات ناگوار ہو تو لکڑی سے خبر لینا، میں واپس آگیا، تو ایک آدمی کو بھیجا جو بیس ہزار درہم (تقریباً پانچ ہزار روپیہ) مجھے دے گیا، اس لڑکی کو عبدالملک بن مروان بادشاہ نے اپنے بیٹے ولید کے لئے جو ولی عہد بھی تھا مانگا تھا، مگر حضرت سعیدؒ نے عذر کر دیا تھا جس کی وجہ سے عبدالملک ناراض بھی ہوا اور ایک حیلہ سے حضرت سعیدؒ کے سو کوڑے سخت سردی میں لگوائے اور پانی کا گھڑا بھی ان پر گروایا۔[1]

مسلمان کی غیبت اور آبروریزی

"اللہ کا راستہ صرف جہاد میں یا نوافل میں یا دوسری عبادات میں منحصر نہیں بلکہ ضروری اعمال و عبادات کرنے کے بعد جو کام بھی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کی رضا اس میں مقصود ہو ادائے حقوق اس کی غرض ہو وہ سب اللہ ہی کا راستہ ہے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دینداری صرف عبادات میں مشغولی کا نام ہے اور دنیا داری کے کاموں میں مشغول ہونا اس کے

---

[1] فضائل ذکر ص ۱۴۵ تا ۱۵۰

منافی ہے وہ غلطی پر ہیں جتنے علماء ہیں سے کوئی بھی نہیں بتاتا کہ اسباب معیشت کو حاصل نہ کیا جائے یا ترک کر دیا جائے البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کو دنیا کی غرض سے نہ کیا جائے ان کو بھی آخرت کی رضا کے واسطے اس کے مقرر کئے ہوئے حقوق کے واسطے حاصل کیا جائے وجاہت، تفاخر، تکبر اور لوگوں کی نگاہ میں بڑائی حاصل کرنے کے واسطے نہ کیا جائے مگر اس سب کے باوجود دوسری جانب بھی قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ ہر شخص کو صاحب غرض سمجھنا یہ بھی اسلامی تعلیم کے منافی ہے اللہ جل جلالہ کا ارشاد ہے یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (سورہ حجرات رکوع ۲) اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو اس لئے کہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور (کسی کے عیب کا) تجسس بھی نہ کیا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے۔ ہم لوگوں کی عام حالت یہ ہے کہ جو شخص ہماری مرضی کے موافق کام کرتا ہے وہ مخلص ہے متقی ہے پرہیزگار ہے لیکن جوں ہی وہ ہماری رائے کے خلاف کوئی کام کرتا ہے وہ خوشامدی ہے، انگریز پرست ہے یا ہندو پرست ہے، خود غرض ہے نفس پرست غدار قوم ہے مکار ہے دغا باز ہے، وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار ہے یا کانگریس کا تنخواہ دار ہے غرض یہ کہ دنیا بھر کے عیوب اس میں جمع ہو جاتے ہیں حالانکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص مسلمان کی عیب پوشی کرتا ہے حق تعالیٰ شانہ قیامت میں اس کی عیب پوشی کریں گے اور جو شخص مسلمان کی پردہ دری کرتا ہے حق تعالیٰ شانہ اس کی پردہ دری کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے گھر میں (چھپ کر) کوئی عیب کرتا ہے تب بھی اس کی فضیحت کرتے ہیں۔[1]

---

[1] الاعتدال فی مراتب الرجال ص ۱۲۳ تا ۱۲۸

حج فنائیت اور عشق کا دلآویز منظر

حج درحقیقت دو منظروں کا نمونہ ہے اور اس کی ہر ہر چیز میں دو حقیقتیں پنہاں ہیں ایک یہ کہ نمونہ ہے موت کا اور مرنے کے بعد کے حالات کا اور دوسرا نمونہ ہے عشق الٰہی محبت کے اظہار کا اور روح کو حقیقی عشق الٰہی حقیقی محبت سے رنگنے کا ___ پہلا نمونہ موت اور اس کے مابعد کا منظر ہے کہ آدمی جس وقت گھر سے چلتا ہے سب عزیز واقارب گھر بار وطن احباب کو یک لخت چھوڑ کر دوسرے ملک گویا دوسرے عالم کا سفر اختیار کرتا ہے جن چیزوں کے ساتھ دل مشغول تھا گھر بار کھیتی باغ احباب کی مجلسیں سب ہی اس وقت چھوٹ رہی ہیں جیسا کہ مرنے کے وقت سب کو یک وقت خیرباد کہنا پڑتا ہے، حج کو روانگی کے وقت یہی چیز قابل غور و فکر اور قابل عبرت واعتبار ہے کہ جیسا آج عارضی مدت کے لئے یہ سب کچھ چھوٹ رہا ہے بہت جلد وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ ہمیشہ کے لئے یہ سب چیزیں چھوٹنے والی ہیں۔

دوسرا منظر اظہار عشق و محبت کا ہے، وہ حاجی کے حال سے ایسا ظاہر اور واضح ہے کہ اس کے لئے کسی تفصیل کی حاجت نہیں ______ بندوں کا تعلق حق تعالےٰ وتقدس کے ساتھ دو طرح کا ہے ایک نیاز مندی اور بندگی کا کہ وہ پاک ذات مالک ہے خالق ہے اس تعلق کا مظہر نماز ہے جو سراسر نیاز اور اظہار عبدیت ہے اسی لئے اس کی ساری چیزیں اسی تعلق کا مظہر ہیں کہ نہایت وقار اور سکون کے ساتھ موزوں لباس اور شاہی آداب کے مناسب حالات کے ساتھ حاضری دربار کی ہے کہ وضو اور پاک کپڑوں کے ساتھ نہایت وقار و سکون سے اول کانوں پہ ہاتھ رکھ کر عبدیت اور اللہ جل شانہ کی

بڑائی کا اقرار کرے پھر ہاتھ باندھ کر معروضِ پیش کرے پھر سر جھکا کر تعظیم کرے اور پھر زمین پر ماتھا رگڑ کر اپنی نیازمندی اور عجز کا اظہار کرے اور آقا کی بڑائی کا زبان سے اقرار کرتا ہے اور کوئی قول و فعل اس کی بڑائی اور اپنے عجز کے خلاف نہ ہو۔

دوسرا تعلق محبت و عشق کا ہے کہ وہ مربی ہے منعم ہے محسن ہے جمال و کمال کے جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں ان سب کے ساتھ متصف ہے ادھر ہر آدمی میں فطری طور پر عشق و محبت کا مادہ موجود ہے ؎

ازل سے حسن پرستی تھی میری قسمت میں ۔۔۔ مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر ۔۔۔ جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

ترے فراق میں جینا بشر کا کام نہیں ۔۔۔ ہزار شکر کہ اس عمر کو دوام نہیں

اسی تعلق کا مظہر حج ہے کہ سفر کی ابتدا ہی میں سب تعلقات کو ختم کر کے سب از یزو اقارب گھر بار سے منہ موڑ کر کوچۂ یار کی طرف جاتا ہے اور جنگلوں اور گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتا ہے کہ یہی دو چیزیں عاشقوں کا کام ہیں ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

اور یہ ساری وحشت اور اشتیاق کیوں ہے یہ اضطراب و بے چینی آخر کیوں مسلط ہوئی ہے؟ اس لئے کہ محبوب کے در پر عشاق کے اجتماع کا ایک وقت مقرر ہے وہ وقت قریب آگیا ہے ؎

اجازت ہو تو آ کر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں

سنا ہے کل ترے در پر ہجوم عاشقاں ہو گا

اور جب اس ارادہ اور جذبہ سے گھر سے نکلتا ہے تو یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ عشق میں مشقت ایک لازمی چیز ہے

سالک راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

جب عشق کے طفیل یہ مبارک سفر ہے تو راستہ کی سب تعب اسی ذوق اور جذبہ کے ماتحت ہونا ضروری ہیں اور اسی فریفتگی سے انہیں برداشت کرنا چاہیے

الفت میں برابر ہے جفا ہو کہ وفا ہو
ہر چیز میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

اس کے بعد احرام بھی اسی عاشقانہ رنگ کا پورا مظہر ہے کہ نہ سر پہ ٹوپی نہ بدن پہ کرتہ فقیرانہ صورت نہ خوشبو نہ زینت ایک مجنونانہ ہیئت جو کرب و بے چینی کے کمال کو ظاہر کرتی ہے

نہ رکھوں اس کا اگر اب بھی میں پروئے جنوں
کیا ہے چاک گریباں تو پھاڑ دامن بھی

اصل یہ تھا کہ گھر سے نکلتے ہی یہ حالت شروع ہو جاتی اس وجہ سے بعض علماء کے نزدیک گھر ہی سے احرام باندھ لینا افضل ہے مگر چونکہ احرام کے بعد بہت سی چیزیں ممنوع ہو جاتی ہیں اور اس قسم کے لباس کا تحمل بھی بعض ناز پروردہ لوگوں کو مشکل ہو جاتا ہے اس لئے اللہ کی رحمت نے اس کی اجازت دے دی کہ شروع سے احرام نہ باندھا جائے کہ اس میں مشقت ہوگی۔ البتہ جب کوئے یار کے قریب پہنچے تو اس کا اہتمام ضروری ہے کہ اس کے کوچہ میں اسی حال میں داخل ہونا ہے کہ سر پہ بال بکھرے ہوئے ہوں از خود رفتہ عاشقوں کی سی صورت ہو اسی کو حضور اقدس نے اپنے پاک ارشاد میں ظاہر فرمایا

"الحاج الشعث التفل" اسی حالت کو حق تعالیٰ شانہٗ خود بھی تفاخر کے طور پر فرشتوں سے ظاہر فرماتے ہیں "انظروا الی زوار بیتی قد جاءونی شعثا غبرا" میرے گھر کے مشتاقوں کو دیکھو کہ میری طرف بکھرے ہوئے بالوں اور گرد و غبار کی حالت میں آئے ہیں۔

اسی حالت میں مستانہ وار "لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک" کا نعرہ لگاتا ہوا روتا اور چلاتا ہوا، نالہ و فریاد کرتا ہوا پہنچتا ہے اسی کی طرف حضور اقدس نے اپنے پاک ارشاد "الحج العج والثج" میں ارشاد فرمایا کہ حج (کا کمال) خوب چلانا اور قربانی کا خون بہانا ہے اور ظاہر بات ہے کہ نالہ و فریاد کے ساتھ چلانا عشق کی جان ہے ؎

نالہ کرنے دیں لللہ مجھے احباب
ضبط کرتا ہوں تو تکلیف سوا ہوتی ہے

اسی بے چینی اور اضطراب، نالہ و فریاد کے ساتھ آخر وہ محبوب کے شہر تک پہنچ جاتا ہے اور مکہ مکرمہ میں داخل ہو جاتا ہے ؎

جذبِ دل نے آج کوئے یار میں پہنچا دیا
جیتے جی میں گلشنِ جنت میں داخل ہو گیا

ایک دل کھویا ہوا جس کے دل میں واقعی زخم محبت ہو جب محبوب کے گھر پہنچ جاتا ہے تو اس پر کیا گذرتی ہے اور وہ کیا سوچتا ہے یہ چیزیں الفاظ سے تعبیر نہیں ہو سکتیں۔ اس کے بعد وہ جو جو حرکتیں کرتا ہے وہ کسی ضابطہ و آئین کی پابند نہیں کہیں محبوب کے گھر کے چکر کاٹتا ہے کہیں اس کے در و دیوار اور چوکھٹ کو چومتا ہے آنکھیں ملتا ہے پیشانی اور سر رگڑتا ہے ؎

سر کو وحشت میں پہاڑوں سے بچا کر لایا
در و دیوار سر کوچۂ جاناں کے لئے

کعبہ شریف کے پردہ سے لپٹنا چمٹنا بھی اسی عاشقانہ شان کا ایک خاص منظر ہے کہ محبوب کے دامن سے چمٹنا بھی عشق کے مظاہر میں سے ایک مخصوص منظر ہے ؎

اے ناتوانِ عشق تجھے حسن کی قسم
دامن کو یوں پکڑ کہ چھڑایا نہ جا سکے

اس کے بعد صفا مروہ کے درمیان دوڑنا بھی اسی مجنونانہ انداز کا ایک پرکیف منظر ہے کہ ننگے سر، نہ کرتہ نہ پاجامہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں ؎

اب نہیں دل کو کسی صورت قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

اس سب کے بعد منیٰ میں شیاطین کے پتھر مارنا اس جنون و وحشت کے آخری حصہ کا نظارہ ہے جو عشاق کو پیش آتا ہے، عاشق کا جنون جب حد سے تجاوز کرتا ہے تو وہ ہر اس شخص کے پتھر مارا کرتا ہے جس کو وہ اپنے کام میں مخل سمجھتا ہے۔ ؏

میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو تجھے سمجھائے ہے

اور سب سے آخر میں قربانی جو حقیقۃً اپنی جان کی قربانی ہے، اللہ جل شانہ نے اپنی عنایتِ رحمت اور رافت سے اس کو جانور کی یعنی مال کی قربانی سے بدل دیا ہے یہی عشق کا منتہا اور آخری حال ہے ؎

موت ہی ہے علاج عاشق کا
اس سے اچھی نہیں دوا کوئی [1]

---

[1] فضائل حج از ص ۱۲۲ تا ۱۲۵ مختصراً

مقامِ صحابہؓ

"بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بعض بڑی خطائیں سرزد ہو جانے پر کبھی بھی کوئی خلجان طبیعت میں نہیں آیا جب کہ مشائخ عظام سے ایسی خطاؤں کا صدور بعید تو ہے اور کوئی بڑے سے بڑا شیخ بھی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا تو ان کی معاصی کی روایات پر اللہ کے فضل سے مجھے کبھی اشکال نہیں ہوا، اکابر کی جوتیوں اور احادیث کی برکت سے ان سب کے متعلق ہمیشہ یہی ذہن میں رہا کہ یہ افعال ان حضرات سے تعلیم کی تکمیل کے لئے تکوینی طور سے کرائے گئے۔ ع

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ان انفاس قدسیہ نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ آپ اپنی شریعت مطہرہ کی تکمیل کیجئے ہم اس کے لئے سنگسار ہونے کو تیار ہیں، ہاتھ کٹانے کو تیار ہیں، کوڑے کھانے کو تیار ہیں یہی میرے نزدیک مصداق ہے قرآن کریم کی آیت "فاولئک یبدل اللہ سیئاتهم حسنات" کا (یعنی یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا) اور یہی مصداق ہیں ان احادیث مغفرت کے جس میں ہے کہ بعض خوش نصیبوں کو کہا جائے گا کہ ہر گناہ کے بدلے میں ایک نیکی دے دو۔

یہاں ایک بات نہایت قابل اہتمام یہ ہے کہ یہ مراحم خسروانہ کہلاتے ہیں کہ مراحم خسروانہ میں قاتلوں کو پھانسی کی سزا سے بھی معاف کر دیا جاتا ہے لیکن اس اطمینان پر کہ یہی تو مراحم خسروانہ میں چھوٹ جاؤں گا قتل کی ہمت کوئی نہیں کرتا، البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ صحابہ کرام سب ان میں داخل ہیں اس لئے کہ

ان کے معاصی کے جو قصے احادیث میں آئے ہیں وہ انھیں مراحم خسروانہ کے مستحق ہیں،
حضرت ماعزؓ سے زنا صادر ہو جاتا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر
ہو کر عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجیے، حضور اقدسؐ نے فرمایا، جا استغفار
کر توبہ کر، وہ تھوڑی دور جاتے ہیں، بے چینی غالب ہوتی ہے، پھر آکر یہی عرض کرتے ہیں،
اور حضور اقدسؐ کا یہی جواب ہوتا ہے، چار دفعہ یہی واقعہ پیش آتا ہے کہ حضور اقدسؐ
انھیں توبہ و استغفار کی تاکید کر کے واپس کر دیتے ہیں، چوتھی دفعہ میں حضور اقدسؐ
حسب قواعد شرعیہ سنگسار کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔

اس پر دو صحابہ نے یوں کہا کہ اس شخص کے گناہ پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈالا، مگر
اس نے اپنے آپ رسوا کیا، حتیٰ کہ کتے کی طرح بے رحم کیا گیا، حضور اقدسؐ نے یہ سن کر سکوت
فرمایا اور آگے تھوڑی دیر چلے تھے کہ ایک گدھا مرا پڑا تھا اور اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا
جس کی وجہ سے اس کی ایک ٹانگ ابھر گئی تھی، حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ فلاں فلاں کہاں
ہیں؟ انھوں نے کہا ہم حاضر ہیں، حضور اقدسؐ نے فرمایا اس مردار سے کھاؤ، انھوں نے
کہا کہ اس کو بھلا کون کھا سکتا ہے، حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ تم نے جو مسلمان بھائی کی آبروریزی
کی وہ اس سے زیادہ سخت ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے
وہ اس وقت جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے۔

احادیث کی کتاب میں اسی نوع کی متعدد روایات ان قصوں کی وارد ہوئی ہیں،
ہم میں سے بڑے سے بڑا بھی کوئی ایسا ہے جو گناہ پر اتنا بے چین ہو جاتا ہے جتنا یہ حضرات
ہوتے تھے۔

اللہ جل شانہ عالم الغیب ہیں، وہ سب کے گناہوں کو بھی جانتے ہیں اور

گناہوں کے بعد ان کے حالات کو بھی اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں باوجود
معاصی کے بھی اپنی رضا اور خوشنودی کے پروانے جگہ جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَالسّٰبِقُوْنَ
الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا
عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ "(اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص (احسان)
کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی
ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں
جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ بیان القرآن)"

اختلافِ صحابہ کے اسباب اور اس کی ضرورت وافادیت

یہاں ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جبکہ تعلیم امت ہی کے
لئے مبعوث ہوئے تھے اور یہی غرض حضور کی تشریف آوری سے وابستہ تھی تو آپ نے جملہ
احکام شرعیہ کو مفصل و واضح ممتاز حالت میں کیوں نہ ارشاد فرما دیا جس سے یہ الجھن ہی
یکسر ختم ہو جاتی اور کسی قسم کی خلش ہی باقی نہ رہتی ظاہری صورت میں تو یہ اشکال بہت ہی
واضح ہے لیکن حقیقت میں نہایت ہی مہمل خدشہ ہے جو احکام شرعیہ پر قلت نظر سے
وارد ہوتا ہے اور فی الواقع حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا امت کے حال پر عنایت و کرم
اور شفقت تھی کہ ان معمولی فروعی مسائل کا ایسا انضباط نہیں فرمایا کہ جس کی وجہ سے امت کو
تنگی پیش آئے بلکہ احکام دینیہ کو دو حصوں پر منقسم فرما دیا ایک وہ احکام ہیں جن میں غور وخوض

له شریعت وطریقت کا تلازم صـ ۱۲۲ تا ۱۲۶ مختصراً۔

وبحث ومباحثہ غیر پسندیدہ قرار فرمادیا دوسرے وہ احکام ہیں جن میں اختلاف کو رحمت کا سبب قرار دیا اور سہولت امت کے لئے ہر عمل کو خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو باعث اجر قرار دے دیا بشرطیکہ محض لاپرواہی سے غلط روی اختیار نہ کی ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھنا چاہیے کہ شریعت نے احکام کو دو طریقوں پر منقسم کر دیا ایک قطعی جن میں کرنے والوں کے فہم و سمجھ کا دخل نہیں رکھا، واضح الفاظ میں بیان فرما دیئے اور ان میں توجیہ و تاویل کی بھی گنجائش نہیں رکھی۔ تاویل سے بھی انحراف کرنے والے کو خاطی و گمراہ قرار دیا، دوسرے وہ احکام ہیں جن میں شریعت نے تنگی نہیں فرمائی بلکہ اس میں امت کے ضعف پر نظر فرماتے ہوئے امت کی سہولت کو مد نظر رکھا اور اس میں توجیہ و تاویل کی وجہ سے عمل نہ کرنے والوں کو خاطی اور بے دین سے تعبیر نہیں فرمایا قسم اول کو اعتقادیات سے تعبیر کیا جاتا ہے اور قسم ثانی کو جزئیات فرعیات شرعیات وغیرہ وغیرہ اسماء سے پکارا جاتا ہے اس دوسری نوع میں حقیقۃ الامر یہ ہے کہ شریعت نے اس میں خود ہی تنگی نہیں فرمائی، اس لئے اس کو تفصیل کے ساتھ کہ ارکان و واجبات وغیرہ خود شارع کی جانب سے معین و مفصل ہو جاتے تو یہ بھی نوع اول میں داخل ہو کر امت کے لئے سخت تنگی کا سبب ہو جاتا اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی اختلاف سے محفوظ مشکل ہوتا اس لئے کہ وہ حقائق سب کے سب الفاظ ہی کے ذریعہ سے ارشاد فرمائے جاتے اور الفاظ میں پھر مختلف معانی نکلنا قریب تھا، الغرض شریعت مطہرہ نے احکام کو اصول و فروع دو امر میں منقسم فرما کر امر اول میں اختلاف کی سختی سے ممانعت فرمائی چنانچہ آیت مقدسہ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ میں تفرق فی الدین کی ممانعت ہے اور قسم دوم میں اختلاف کو امت کے لئے رحمت کا سبب قرار دیا۔

اور اسی وجہ سے اس نوع کے اختلافات میں جن کے سیکڑوں واقعات نبوی دور مقدس میں گذرے ہیں تشدد نہیں فرمایا امثلہ کے طور پر دو واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ نسائی نے طارق کے واسطے سے دو صحابہ کا قصہ نقل فرمایا کہ وہ دونوں جنبی ہوئے ان میں سے ایک نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے نماز نہیں پڑھی (غالباً تیمم کا نزول اس وقت تک نہیں ہوا ہوگا یا ان کو نہیں پہنچا ہوگا) حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصویب فرمائی دوسرے صحابی نے تیمم سے نماز ادا فرمائی حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھی تصویب فرمائی اسی طرح حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو قبیلہ بنو قریظہ میں نماز عصر پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا، اس پر عمل کرنے والوں میں سے بعض نے وہاں عصر پڑھنے کے حکم کو اصل قرار دیا، اور راستہ میں نماز نہ پڑھی اگرچہ نماز کو تاخیر ہوئی مگر ان لوگوں نے ظاہر اتثال امر کو ضروری خیال فرمایا، دوسری جماعت نے اسی امر کا حقیقی مقصد تعجیل پہونچنا سمجھ کر راستہ میں عصر کی نماز اپنے وقت پر ادا فرمائی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریق پر اعتراض نہیں فرمایا، بخاری میں یہ مفصل قصہ موجود ہے اسی طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں یا بجملہ فرعی اختلاف اور چیز ہے اور اصولی اختلاف اور ہے جو لوگ اس اختلاف کو اصولی اختلاف کے مشابہ سمجھ کر ایسی روایات و آیات کو اس پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں جو اختلاف مذموم کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں وہ ان کی ناواقفیت یا دھوکہ دہی ہے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ شریعت مطہرہ نے اس فرعی اختلاف میں بڑی وسعت و سہولت رکھی ہے اگر یہ صورت نہ ہوتی تو امت کے لئے اسقدر تنگی پیش آجاتی کہ تحمل سے باہر ہو جاتا، اسی وجہ سے ہارون رشید نے جب بھی امام مالکؒ سے یہ درخواست کی کہ موطا امام مالک کو بیت اللہ شریف پر لٹکا کر امت کو اس پر عمل کا امر کر دیا

تاکہ افتراق نہ ہو۔ تو امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو بھی اس کو قبول نہیں فرمایا اور
جیسے ہی جواب دیا کہ صحابہ مسائل فرعیہ میں مختلف ہیں اور وہ سب کے سب ہی با توفیق
ہیں دونوں کے اقوال و مسالک معمول بہا ہیں ان کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایسے ہی
جب منصور نے حج کیا اور امام مالک سے درخواست کی کہ آپ اپنی مؤلفات مجھے دے دیجئے
تاکہ میں ان کی نقلیں بلاد اسلامیہ میں شائع کر دوں اور مسلمانوں کو حکم کر دوں کہ ان سے
تجاوز نہ ہوں تو آپ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین ایسا ہرگز نہ کیجئے لوگوں کے پاس احادیث
واقوال صحابہ پہنچے ہوئے ہیں وہ ان پر عامل ہیں ان کو اسی کے موافق عمل کرنے دیجئے۔
یہی منشا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کہ میری امت کا اختلاف
رحمت کا سبب ہے۔ اور یہی وہ کھلی رحمت ہے جو آنکھوں سے نظر آتی ہے آج ہر امام
کے نزدیک مختلف فیہ مسائل میں دوسرے کے مذہب پر شرعی ضرورت کی وجہ سے فتویٰ
دینا جائز ہے لیکن اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو کسی ضرورت سے بھی اجماعی و متفق علیہ شئی کو
چھوڑنا جائز نہ ہوتا۔ غرض حقیقت میں یہ اختلاف ائمہ شرعاً مطلوب ہے جس میں
ایک ہی فائدہ نہیں جو مذکور ہوا اس کے علاوہ بھی بہت سے فوائد مضمر ہیں۔[1]

اختلافات صحابہؓ کے مفید ثمرات

حضرت عمر بن عبدالعزیز جن کا لقب عمر ثانی ہے اور ان کی خلافت خلافت راشدہ
کے گویا برابر سمجھی جاتی ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ ما سرّنی لو ان اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لم
یختلفوا لانهم لو لم یختلفوا لم تكن رخصة۔ مجھے اس بات سے مسرت نہ ہوتی کہ

---

[1] اختلاف ائمہ صفحہ ۲ تا ۳

حضورؐ کے صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا اس لئے کہ ان میں اگر اختلاف نہ ہوتا تو گنجائش نہ رہتی
(زرقانی علی المواہب) دارمی نے بھی اس قسم کا مقولہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا نقل کیا ہے
اور اس کے بعد لکھا ہے کہ پھر حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنی سلطنت میں یہ احکام بھیج دیئے
کہ ہر قوم اس کے موافق عمل کرے جو وہاں کے علماء کا فتویٰ ہو عونؒ بن عبداللہ تابعی جو
بڑے قراء اور بڑے عابدین میں ہیں کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ
میں اختلاف نہ ہوا اس لئے کہ اگر وہ حضرات کسی چیز پر مجتمع ہوں اور پھر کوئی شخص اس کے
خلاف کرے تو وہ تارک سنت ہے اور اگر ان میں اختلاف ہو پھر کوئی شخص ان کے
اقوال میں سے کسی پر عمل کرلے تو وہ حدود سنت سے نہیں نکلا (دارمی) عبداللہ بن
مبارکؒ جو جلیل القدر امام ہیں کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے مقابلہ میں کسی کا قول معتبر
نہیں نہ صحابہ کے اجماعی قول کے مقابلہ میں ہاں جس چیز میں صحابہ میں اختلاف ہے
اس میں ہم اس چیز کو اختیار کریں گے جو قرآن و حدیث کے زیادہ قریب ہوگی دوسری
جگہ ارشاد فرماتے ہیں صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جائیں گے (مقدمہ اوجز) درمختار
اور شامی میں لکھا ہے کہ مجتہدین کا اختلاف رحمت ہے اور جتنا بھی اختلاف زیادہ ہوگا
رحمت زیادہ ہوگی اور میں پوچھتا ہوں کہ علماء کا اختلاف کب نہیں ہوا کون سا دور نہ
کون سا وقت ابتداء اسلام بلکہ ابتدائے عالم سے ایسا گزرا ہے جس میں علماء کا اور
اہل حق کا اختلاف نہیں ہوا خود حق جل وعلا نے سارے ہی انبیاء پر کیا ایک ہی
دین اتارا اصول دین میں اتحاد رہا اور فروع میں ہمیشہ اختلاف رہا کیا داؤد اور
حضرت سلیمان علی نبینا علیہما السلام کے متعدد فیصلوں میں اختلاف نہیں ہوا اور
باوجود اس اختلاف کے حق تعالیٰ شانہ نے دونوں کی مدح نہیں

فرمائی ہے۔[1]

احکامِ دین کا استخفاف

٭ ...... نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص قصداً بلا کسی شرعی عذر کے ایک دن بھی رمضان کے روزہ کو افطار کر دے غیرِ رمضان کا روزہ چاہے تمام عمر کے روزے رکھے اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔[2]

بعض علماء کا مذہب جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ وغیرہ حضرات بھی ہیں اس حدیث کی بناء پر یہ ہے کہ جس نے رمضان المبارک کے روزہ کو بلا وجہ کھو دیا اس کی قضا ہو ہی نہیں سکتی چاہے عمر بھر روزے رکھتا رہے مگر جمہور فقہاء کے نزدیک اگر رمضان کا روزہ رکھا ہی نہیں تو ایک روزے کے بدلے ایک روزہ سے قضا ہو جائیگی اور اگر روزہ رکھ کر توڑ دیا تو قضاء کے ایک روزہ کے علاوہ دو مہینہ کا روزہ کفارہ کے ادا کرنے سے فرض ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے البتہ وہ برکت ہاتھ نہیں آ سکتی کہ جو رمضان شریف میں روزہ رکھنے سے حاصل ہوتی یہ سب کچھ اس حالت میں ہے کہ بعد میں قضا بھی کرے اور اگر سرے سے رکھے ہی نہیں جیسا کہ اس زمانہ کے بعض فساق کی حالت ہے تو اس کی گمراہی کا کیا پوچھنا، روزہ ارکانِ اسلام سے ایک رکن ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ارشاد فرمائی ہے سب سے اول توحید و رسالت کا اقرار اس کے بعد اسلام کے چاروں مشہور رکن نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ کتنے مسلمان ہیں جو مردم شماری میں مسلمان شمار ہوتے ہیں لیکن ان پانچوں میں سے ایک بھی کرنے والے نہیں

---

[1] الاعتدال فی مراتب الرجال صـ ۱۹۴ تا ۱۹۸

سرکاری کاغذات میں وہ مسلمان لکھے جائیں مگر اللہ کی فہرست میں وہ مسلمان شمار نہیں ہو سکتے
حتیٰ کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ اسلام کی بنیاد تین چیزیں ہیں کلمۂ شہادت
اور نماز اور روزہ جو شخص ان میں سے ایک بھی چھوڑ دے وہ کافر ہے اس کا خون کر دینا حلال ہے
علماء نے ان جیسی روایات کو انکار کے ساتھ مقید کیا ہو یا کوئی تاویل فرمائی ہو مگر اس سے
انکار نہیں کہ نبی کریمؐ کے ارشادات ایسے لوگوں کے بارے میں سخت سے سخت وارد ہوئے
ہیں فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرنے والوں کو اللہ کے قہر سے بہت زیادہ ڈرنے کی
ضرورت ہے کہ موت سے کسی کو چارہ نہیں دنیا کی عیش و عشرت بہت جلد چھوٹنے والی
چیز ہے کام آنے والی چیز صرف اللہ کی اطاعت ہے بہت سے جاہل تو اتنے ہی پر کفایت
کرتے ہیں کہ روزہ نہیں رکھتے لیکن بہت سے بد دین زبان سے بھی اس قسم کے الفاظ بک
دیتے ہیں کہ جو کفر تک پہنچا دیتے ہیں مثلاً روزہ وہ رکھے جس کے گھر کھانے کو نہ ہو یا ہمیں
بھوکا مارنے سے اللہ کو کیا مل جاتا ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے الفاظ سے بہت ہی زیادہ
احتیاط کی ضرورت ہے اور بہت غور و اہتمام سے ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہئے کہ دین کی چھوٹی
سے چھوٹی بات کا تمسخر اور مذاق اڑانا بھی کفر کا سبب ہوتا ہے اگر کوئی شخص عمر بھر نماز نہ پڑھے
کبھی بھی روزہ نہ رکھے اسی طرح کوئی اور فرض ادا نہ کرے بشرطیکہ اس کا منکر نہ ہو وہ کافر
نہیں جتنے فرض کو ادا نہیں کرتا اس کا گناہ ہوتا ہے اور جو اعمال ادا کرتا ہے اس کا اجر ملتا
ہے لیکن دین کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ بات کا تمسخر بھی کفر ہے جس سے اور بھی تمام عمر کے نماز
روزہ نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں بہت زیادہ قابل لحاظ امر ہے اس لئے روزہ کے
متعلق بھی کوئی ایسا لفظ ہرگز نہ کہے اور اگر تمسخر وغیرہ نہ کرے تب بھی بغیر عذر افطار کرنے والا
فاسق ہے حتیٰ کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو شخص رمضان میں علی الاعلان بغیر عذر کے کھاوے

اس کو قتل کیا جائے لیکن قتل پر اگر اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے قدرت نہ ہو کہ یہ کام امیر المؤمنین کا ہے تو اس فرض سے کوئی بھی سبکدوش نہیں کہ اس کی اس ناپاک حرکت پر اظہار نفرت کرے اور اس سے کم تو ایمان کا کوئی درجہ ہی نہیں کہ اس کو دل سے برا سمجھے۔[1]

اسلامی اور غیر اسلامی نکاح

"علماء نے لکھا ہے کہ دو عبادتیں ایسی ہیں کہ جو حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہو کر قیامت تک بلکہ جنت میں بھی باقی رہیں گی ایک ایمان، دوسری نکاح، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا اور ارشاد فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں مگر ہم لوگوں نے اس بابرکت سنت کو بے حد لغویات اس میں شامل کر کے اس کو ایک مصیبت عظمیٰ بنا لیا حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں یہ سنت دین کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ لغویات جو ہم نے شامل کر لی ہیں ان کا شائبہ بھی اس زمانے میں نہیں تھا صحابہ کرام کو جو عشق حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے تھا وہ کسی سے مخفی نہیں اس کے کچھ نمونے میں اپنے رسالہ "حکایات صحابہ" میں لکھ بھی چکا ہوں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک مشہور صحابی ہیں عشرہ مبشرہ میں ہیں حضور کے جانثاروں میں ہیں مگر اپنی شادی میں حضور کو بلانا تو درکنار خبر بھی نہ کی جب حضور نے ان کے کپڑوں پر کچھ صفرہ کا اثر دیکھا یہ ایک قسم کی خوشبو ہے جو اس زمانے میں شادیوں کے موقع پر استعمال

---

[1] فضائل رمضان ص ۳۲ تا ۳۳

کی جاتی تھی اس کو دیکھ کر حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے کیا تم نے شادی کر لی؟ انھوں نے عرض کیا جی حضورؐ۔ حضورؐ کا پاک ارشاد ہے جو نکاح بہت ہلکا پھلکا ہو وہ بہت مبارک ہے مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس مبارک سنت کو اپنی رسوم کی بدولت مشکل ترین بنا دیا۔ معلوم نہیں کتنی نمازیں اس کی نذر ہو جاتی ہیں بعض جگہ تو مصیبت یہ ہے کہ عین نماز کے وقت بارات رخصت ہوتی ہے کہ جس سے دولہا دلہن اور سب باراتیوں کی جماعت فوت ہوتی ہے۔ جس کی ابتدا اس نحوست سے ہوئی ہو اس کی انتہا پر جیسا کچھ ویرانیاں فتنے فساد جتنے ہوں وہ کم ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ جو حمل اس صحبت سے ٹھہرے جو نماز کے وقت میں کی گئی ہو یعنی اس سے نماز فوت ہوئی ہو تو اس سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ عاق بالوالدین ہوتا ہے یعنی والدین کا نافرمان اور ان کو تکلیف پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہماری اصلاح فرماوے اور ہم کو ہدایت سے نوازے اور اس سے بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ ان ہی لغویات کی وجہ سے لڑکیاں ایک لمبی عمر تک بیٹھی رہتی ہیں شادی کا انتظام نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ بعض جگہ اس مصیبت کے لئے سود پر روپیہ لینا پڑتا ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول سے لڑائی اور اعلان جنگ بتلایا گیا ہے۔ اللہ سے لڑائی اور اس کے پاک رسول سے اعلان جنگ کے بعد کون پنپ سکتا ہے اور ان ساری مصیبتوں کا عذر اور مجبوری یہ بتلائی جاتی ہے کہ ناک کٹ جاتی ہے۔ میں نے تو سینکڑوں اکابر و احباب کو ان خرافات کے بغیر سادگی کے ساتھ نکاح کرتے دیکھا مگر کسی ایک کی بھی ناک کٹی ہوئی نہ دیکھی۔[1]

---

[1] آپ بیتی نمبر۳ یا یادِ ایام نمبر۳ صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۲

صحبت کا اثر

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ مسلمان کے علاوہ کسی کے ساتھ مصاحبت اور ہم نشینی نہ رکھو اور تیرا کھانا بجز متقی نہ کھائے" ف: اس حدیث پاک میں حضور اقدس ﷺ نے دو آداب ارشاد فرمائے ہیں۔ اول یہ کہ ہم نشینی اور نشست و برخاست غیر مسلم کے ساتھ نہ رکھو۔ اگر اس سے کامل مسلمان مراد ہے تب تو مطلب یہ ہے کہ فاسق فاجر لوگوں کے ساتھ بحالت اختیار نہ کرو دوسرے جملہ میں چونکہ متقی کا ذکر ہے اس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے نیز اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ ایک حدیث میں حضور کا ارشاد ہے کہ نہ داخل ہوں تیرے گھر میں مگر متقی لوگ (کنز) اور اگر اس سے مطلقاً مسلمان مراد ہے تو مطلب یہ ہے کہ کافروں کے ساتھ بے ضرورت نشست اختیار نہ کی جائے اور ہر صورت میں تنبیہ مقصود ہے اچھی صحبت اختیار کرنے پر اس لئے کہ آدمی جس قسم کے لوگوں میں کثرت سے نشست و برخاست رکھا کرتا ہے اسی قسم کے آثار آدمی میں پیدا ہوا کرتے ہیں اسی بنا پر حضور کا وہ ارشاد ہے جو ابھی گذرا کہ تیرے گھر میں متقیوں کے علاوہ داخل نہ ہوں یعنی ان سے میل جول ہوگا تو ان کے اثرات پیدا ہوں گے حضور اقدس ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ صالح ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے کی سی ہے اگر اس کے پاس بیٹھا جائے تو وہ تھوڑا سا مشک کا ہدیہ بھی دیدیگا تو اس سے بھی خرید لیگا اور دونوں باتیں نہ ہوں تو پاس بیٹھنے کی وجہ سے مشک کی خوشبو سے دماغ معطر رہے گا اور فرحت پہونچتی رہے گی اور برے ساتھی کی مثال لوہار کی بھٹی کے پاس بیٹھنے والے کی ہے کہ اگر اس کی بھٹی سے کوئی چنگاری اڑ کر لگ گئی تو کپڑے جلا دے گی اور یہ بھی نہ ہو تو بدبو اور دھواں تو کہیں گیا ہی نہیں (مشکوٰۃ) ایک اور حدیث میں ہے کہ آدمی

اپنے دوست کے مذہب پر ہوا کرتا ہے پس اچھی طرح غور کر لے کہ کس سے دوستی کرتا ہے (مشکوٰۃ)
مطلب یہ ہے کہ پاس بیٹھنے کا اور صحبت کا اثر یہ ہے کہ رفتہ رفتہ آدمی میں سرایت کرتا رہتا
ہے یہاں تک کہ آدمی اس کا مذہب بھی اختیار کر لیا کرتا ہے اس لئے پاس بیٹھنے والوں کی
دینی حالت میں اچھی طرح سے غور کر لینا چاہئے، بد دینوں کے پاس کثرت سے بیٹھنے سے
بد دینی آدمی میں پیدا ہوا کرتی ہے، روز مرہ کا تجربہ ہے کہ شراب پینے والوں کے شطرنج
کھیلنے والوں کے پاس تھوڑے دن کثرت سے نشست بیٹھنا ہو تو یہ مرض دل کو لگ جاتے
ہیں، ایک اور حدیث میں ہے حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابو رزینؓ سے فرمایا کہ میں تجھے
ایسی چیز بتاؤں جس سے اس چیز پر قدرت ہو جائے جو دارین کی خیر کا سبب ہو، اللہ کا
ذکر کرنے والوں کی مجلس اختیار کر اور جب تو تنہا ہوا کرے تو جس قدر بھی ہو سکے اللہ کے
ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دیتا رہا کر، اور اللہ کے لئے دوستی کر اور اسی کے لئے دشمنی کر"
(مشکوٰۃ) یعنی جس سے دوستی یا دشمنی ہو وہ اللہ ہی کی رضا کے واسطے ہو، اپنے نفس کے واسطے
نہ ہو، امام غزالی فرماتے ہیں کہ جس شخص کی مصاحبت اختیار کرے اس میں پانچ چیزیں
ہونا چاہئیں، اول صاحب عقل ہو اس لئے کہ عقل اصل رأس المال ہے بے وقوف کی
مصاحبت میں کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کا مآل کار وحشت اور قطع رحمی ہے، حضرت
سفیان ثوری سے تو یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ احمق کی صورت کو دیکھنا بھی خطا ہے، دوسرا
چیز یہ ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہوں کہ جب آدمی کے اخلاق خراب ہوں تو وہ عقل پر سوار ہو کر
غالب آجاتے ہیں، ایک آدمی سمجھدار ہے، بات کو خوب سمجھتا ہے لیکن غصہ، شہوت، بخل وغیرہ
اس کو اکثر عقل کا کام نہیں کرنے دیتے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ وہ فاسق نہ ہو اس لئے کہ جو شخص
اللہ جل شانہ سے بھی نہ ڈرتا ہو اس کی دوستی کا کوئی اعتبار نہیں، نہ معلوم کس جگہ کس مصیبت میں پھنسا دے

پھنسا دے یہ چوتھی چیز یہ ہے کہ وہ بدعتی نہ ہو کہ اس کے تعلقات سے بدعت کے ساتھ متاثر
ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اس کی نحوست کے متعدی ہونے کا خوف ہے بدعتی اس کا مستحق
ہے کہ اس سے تعلقات اگر ہوں تو منقطع کر لئے جائیں نہ یہ کہ تعلقات پیدا کئے جائیں
پانچویں چیز یہ ہے کہ وہ دنیا کمانے پر حریص نہ ہو کہ اس کی صحبت سم قاتل ہے اس لئے کہ
طبیعت تشبہ اور اقتدا پر مجبور ہوا کرتی ہے اور مخفی طور پر دوسرے کے اثرات لیا کرتی
ہے (احیاء)... اثرات کا لینا آدمیوں ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ جس چیز کے ساتھ
آدمی کا تلبس زیادہ ہوا کرتا ہے اس کے اثرات مخفی طور پر آدمی کے اندر آجایا کرتے ہیں حضور اقدس
سے نقل کیا گیا کہ بکریوں والوں میں مسکنت ہوتی ہے اور فخر و تکبر گھوڑے والوں میں ہوتا ہے شراح نے
اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان دونوں جانوروں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں اونٹ اور بیل والوں
میں شدت اور سخت دلی بھی وارد ہوئی ہے۔ دوسرا ادب حدیث بالا میں یہ ہے کہ تیرا کھانا متقی
لوگ ہی کھائیں یہ مضمون بھی متعدد روایات میں آیا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اپنا کھانا متقی لوگوں کو
کھلاؤ اور اپنے احسان کا مومنوں کو مورد بناؤ (اتحاف) علماء نے لکھا ہے کہ اس سے مراد دعوت
کا کھانا ہے حاجت کا کھانا نہیں ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اپنے کھانے سے اس شخص کی
ضیافت کرو جس سے اللہ کی وجہ سے محبت ہو (اتحاف) اور حاجت کے کھانے میں حق تعالیٰ
شانہ نے قیدیوں کے کھلانے کی بھی مدح فرمائی ہے اور قیدی اس زمانے کے کافر تھے (مظاہر)
احادیث کے سلسلے میں ——————————————
گذر چکا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کی بخشش اسی وجہ سے مغفرت ہوئی کہ اس نے ایک پیاسے
کتے کو پانی پلایا تھا اور بھی متعدد روایات میں مختلف مضامین سے اس کی تائید ہوتی ہے۔
حضور نے تو کیا عمدہ اور صاف ارشاد فرمایا کہ ہر جاندار میں اجر ہے اس میں متقی کی تخصیص نہ مسلم کافر کی

جیسوان سب ہی داخل ہیں لہٰذا احتیاج اور ضرورت کے کھانے میں یہ چیزیں جہاں دیکھی جاتی وہاں تو احتیاج کی شدت اور قلت دیکھی جاتی ہے جتنی زیادہ احتیاج ہو اتنا ہی زیادہ ثواب ہوگا یہ کھانا دعوت اور تعلقات کا ہے اس میں بھی اگر کوئی دینی مصلحت یا خیر کی نیت ہو تو جس درجہ کی وہ خیر اور مصلحت ہوگی اسی درجہ کا اجر ہوگا البتہ اگر کوئی دینی مصلحت نہ ہو تو پھر کھانے والا جتنا زیادہ متقی ہوگا اتنا ہی زیادہ اجر کا سبب ہوگا۔[1]

داعیوں اور مبلغوں کی ذمہ داری

"ایک خاص مضمون پر تنبیہ مقصود ہے وہ یہ کہ جس طرح اس زمانہ میں تعلیم تبلیغ میں کمی ہو رہی ہے اور عام طور پر لوگ اس سے بہت زیادہ غافل ہو رہے ہیں اسی طرح بعض لوگوں میں ایک خاص مرض یہ ہے کہ جب وہ کسی دینی منصب تقریر، تحریر، تعلیم، تبلیغ، وعظ وغیرہ پر مامور ہو جاتے ہیں تو دوسروں کی فکر میں ایسے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اپنے سے غفلت ہو جاتی ہے حالانکہ جس قدر دوسروں کی اصلاح کی ضرورت ہے اس سے بہت زیادہ اپنے نفس کی اصلاح کی احتیاج ہے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع میں بہت زیادہ اہتمام سے منع فرمایا ہے کہ لوگوں کو نصیحت کرتا پھرے اور خود مبتلائے معاصی رہے۔

آپ نے شب معراج میں ایک جماعت کو دیکھا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کترے جاتے تھے آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو حضرت جبرئیل نے عرض کیا کہ یہ لوگ آپ کی امت کے واعظ و مقرر ہیں کہ دوسروں کو نصیحت کرتے تھے اور خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے (مشکوٰۃ شریف)

---

[1] فضائل صدقات اول ص۱۹۴تا۱۹۵

ایک حدیث میں وارد ہے کہ اہل جنت کے چند لوگ بعض اہل جہنم سے جا کر پوچھیں گے کر تم یہاں کیسے پہونچ گئے ہم تو جنت میں تمہاری ہی بتائی باتوں پر عمل کرنے کی بدولت پہنچے ہیں وہ کہیں گے کہ ہم تم کو تو بتلاتے تھے مگر خود عمل نہیں کرتے تھے ایک دوسری حدیث میں وارد ہے کہ بدکار قرّاء (علماء) کی طرف عذابِ جہنم زیادہ سرعت سے چلے گا، وہ اس پر تعجب کریں گے کہ بت پرستوں سے بھی پہلے ان کو عذاب دیا جاتا ہے تو جواب ملے گا کہ جاننے کے باوجود کسی جرم کا کرنا انجان ہو کر کرنے کے برابر نہیں ہو سکتا۔[1]

قرآن کی حفاظت واشاعت میں سربراہان قوم کی مجرمانہ غفلت

بیجا نہ ہوگا اگر میں یہاں پہنچ کر سربرآوردگان قوم کی شکایت کروں کہ قرآن پاک کی اشاعت میں آپ کی طرف سے کیا اعانت ہوتی ہے اور یہی نہیں بلکہ خدارا ذرا غور سے جواب دیجئے کہ اس کے سلسلے کو بند کرنے میں آپ کا کس قدر حصہ ہے آج اس کی تعلیم کو بے کار بتلایا جاتا ہے اضاعت عمر سمجھا جاتا ہے اس کو بے کار دماغ سوزی اور بے نتیجہ عرق ریزی کہا جاتا ہے ممکن ہے کہ آپ اس کے موافق نہ ہوں لیکن ایک جماعت جب ہمہ تن اس میں کوشاں ہے تو کیا آپ کا سکوت اس کی اعانت نہیں ہے مانا کہ آپ اس خیال سے بیزار ہیں مگر آپ کی اس بیزاری نے کیا فائدہ دیا ہے

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

آج اس کی تعلیم پر بڑے زور سے اس لئے انکار کیا جاتا ہے کہ مسجد کے ملّاؤں نے اپنے

---

[1] فضائل تبلیغ ص ۲۰

مکڑوں کے لئے دھندا کر رکھا ہے گویہ عاشقینوں پر حملہ ہے یہ بڑی سخت ذمہ داری ہے اور اپنے وقت پر اس کا ثبوت دینا ہوگا مگر میں نہایت ہی ادب سے پوچھتا ہوں کہ خدارا ذرا اس کو تو غور کیجئے کہ ان خود غرض ملانوں کی ان خود غرضیوں کے ثمرات آپ دنیا میں کیا دیکھ رہے ہیں اور آپ کی ان بے غرضانہ تجاویز کے ثمرات کیا ہوں گے اور نشر و اشاعت کلام پاک میں آپ کی ان مفید تجاویز سے کس قدر مدد ملے گی بہرحال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آپ کے لئے قرآن شریف کے پھیلانے کا ہے اس میں آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اس ارشاد نبوی کی کس حد تک امتثال آپ کی ذات سے ہوا اور ہو رہا ہے۔ دیکھئے ایک دوسری بات کا بھی خیال رکھیں بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم اس خیال میں شریک نہیں تو ہم کو کیا مگر اس سے آپ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے صحابہ نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا "أَنَهْلِكُ وَفِينَا الصَّالِحُونَ قَالَ نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ" (کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے کہ ہم میں صلحاء موجود ہوں حضور نے ارشاد فرمایا کہ ہاں جب خباثت غالب ہو جائے) اسی طرح ایک روایت میں آیا ہے کہ حق تعالے شانہ نے ایک گاؤں کے الٹ دینے کا حکم فرمایا حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ اس میں فلاں بندہ ایسا ہے کہ جس نے کبھی گناہ نہیں کیا ارشاد ہوا کہ صحیح ہے مگر یہ میری نافرمانی ہوتے ہوئے دیکھتا رہا اور کبھی اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑا، درحقیقت علماء کو یہی امور مجبور کرتے ہیں کہ وہ ناجائز امور کو دیکھ کر ناگواری کا اظہار کریں جس کو ہمارے روشن خیال تنگ نظری سے تعبیر کرتے ہیں آپ حضرات اپنی اس وسعت خیالی اور وسعت اخلاق پر مطمئن نہ رہیں کہ یہ فریضہ صرف علماء ہی کے ذمہ نہیں ہر اس شخص کے ذمہ ہے جو کسی ناجائز بات کا وقوع دیکھے اور اس پر ٹوکنے کی قدرت رکھتا ہو

بہر نوع ٹوکے لہ ۔

لہ فضائل قرآن مجید صفحہ ۹۲-۹۳

INDEX

اشاریہ

"سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ"

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

(اصل نام حروف تہجی کے اعتبار سے ہیں القاب خطابات بریکیٹ میں ہیں)

کتابیات

مقامات

ی

متفرقات

ادارے، تحریکات اور مدارس:

مساجد:

دیگر متفرقات:

مکتبہ اسلام کی دیگر اہم مطبوعات

- **سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ** - از مولانا ابوالحسن علی ندوی

عہد حاضر کی مشہور دینی شخصیت اور عارف باللہ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے حالات زندگی، ان کی شخصیت، ان کے نمایاں صفات، ان کا انداز تربیت، توازن و جامعیت، تعلق باللہ، خلوص و محبت، فیض و تاثیر اور معرفت و سلوک کا ایمان افروز اور ولولہ انگیز تذکرہ۔ قیمت

- **مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی** از مولانا ابوالحسن علی ندوی قیمت

- **حیاتِ خلیل** از مولانا محمد ثانی ندوی مظاہریؒ

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی مفصل سوانح حیات، خاندانی اور وطنی، علمی و سیاسی ماحول، مشہور تصنیفیں اور خانوادے، تعلیمی، تدریسی اور تنظیمی سرگرمیاں، صفات و کمالات، علمی و دینی خدمات، تزکیۂ نفوس، ارشادات و ملفوظات، تصنیفات و تالیفات، اہم عصر علماء و مشائخ کی رائیں، خلفاء و مجازین کا تذکرہ اور مظاہر العلوم کی مختصر تاریخ۔ قیمت۔

- **زادِ سفر** مترجمہ امۃ اللہ تسنیم

امام نوویؒ رحمۃ اللہ علیہ شارح صحیح مسلم کی مقبول کتاب ریاض الصالحین کا سلیس ترجمہ، ضروری حواشی و تشریحی عنوانات کے ساتھ۔ حدیث شریف کا ایک چھوٹا سفری کتب خانہ اور منزل آخرت کا بہترین زادِ سفر۔ مکمل دو جلدوں میں قیمت

دعوت و تبلیغ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نادر اور مفید تحفہ

سوانح

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی

تالیف	مقدمہ
مولانا محمد ثانی حسنی	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مکمل اور مستند سوانح حیات اس مجاہد کی داستان جس نے اپنی جان اللہ کے راستے میں دے دی

○ خاندان کاندھلہ جھنجھانہ کے حالات ○ حضرت مولانا محمد الیاس کا تذکرہ ○ تبلیغی جماعت کے مجاہدوں اور سفروں کی مکمل سرگزشت اور مکمل جائزہ

یہ کتاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ — کی زیر نگرانی لکھی گئی ہے ○ آخری باب حضرت شیخ الحدیث رح کے حالات پر ہے جس کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے مرتب کیا ہے۔

قیمت

مکتبۂ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ

زادِ سفر

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح صحیح مسلم کی مقبول کتاب "ریاض الصالحین"

کا سلیس ترجمہ ضروری حواشی و تشریحی عنوانات کے ساتھ

مترجمہ

امۃ اللہ تسنیم مرحومہ

ہمشیرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی